حصہ اول

قومی زندگی میں نظریہ کی اہمیت

① قومی زندگی میں نظریہ کی اہمیت اور پاکستان کی نظریاتی اساس

② نظریاتی اساس: بنیادیں، رکاوٹیں اور اقدامات

③ نظریاتی اساس: پارلیمنٹ اور عدلیہ کا کردار

④ نظریاتی اساس، دستور پاکستان اور قراردادِ مقاصد

قومی زندگی میں نظریہ کی اہمیت اور
پاکستان کی نظریاتی اساس

پروفیسر خورشید احمد کے قلم سے نکلی یہ تحریر دراصل پاکستان، دو قومی نظریہ اور اس کے اثرات کا تفصیلی بیان ہے۔ بعض نام نہاد سیکولر دانشوروں نے قائد اعظمؒ کی پاکستانی پارلیمنٹ میں ۱۱؍ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پاکستان کے قیام کے مقاصد سے متعلق جو فکری انتشار پھیلانے کی کوشش کی، اس کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر خورشید احمد نے دو قومی نظریہ کی تاریخ اور اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

فرد ہو یا قوم، نظریے اور مقصود حیات کے بغیر اس کی ترقی اور استحکام ممکن نہیں۔ علامہ اقبال نے اس نکتے کو بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے:

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

(اسرار و رموز)

(فرد کی زندگی جان و تن کے تعلق سے قائم ہے، اور قوم کی زندگی اپنی قدیم روایات کے تحفظ سے قائم رہتی ہے۔ فرد کی موت جوئے حیات خشک ہو جانے سے واقع ہو جاتی ہے، اور قوم کی موت مقصودِ حیات ترک کر دینے سے ہے۔)

پاکستان آج ایک مخصوص لابی کی شرانگیز عالمی مہم کے نتیجے میں جن حالات سے دوچار ہے، وہ 'حفظ ناموس کہن' کے لیے خطرہ اور 'ترک مقصود حیات' کے تباہ کن راستے کی طرف دھکیلے جانے کا سامان ہے۔ ان خطرات اور اس بین الاقوامی یلغار کا بروقت مقابلہ آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

فرد اور قوم دونوں ہی کی زندگی میں نظریہ، تصورِ حیات اور زندگی کے مقصود کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ قرآن نے انسان کی سب سے بڑی ضرورت، ہدایت کو قرار دیا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اس کی سب سے بنیادی دعا ہے اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اس دعا کا جواب ہے۔ قرآن پاک میں تخلیق آدم کے واقعے کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، اس کا مرکزی نکتہ انسان کا مقصدِ وجود ہے، یعنی خلافت اور نیابتِ الٰہی اور پورا قرآن اس ہدایت کا امین ہے جو انسان کو یہ کردار ادا کرنے کے لائق بناتا ہے۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی چیز یہ ہے جس انسان کو اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا، اسے علم الاشیاء سے نوازا۔ اسے عقل، ارادے اور اختیار کی دولت سے مالا مال کیا۔ اس کے اندر خیر اور شر دونوں کا داعیہ رکھا: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس ۹۱:۸)، اسے حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت سے نوازنے کے بعد ہدایت سے بھی نوازا اور کامیابی کی شاہراہ کو روشن کرکے اسے بتا دیا کہ جو ہدایت کی پیروی کرے گا وہی کامیاب ہے اور جو اس سے رُوگردانی کرے گا وہ ناکام و نامراد ہے:

> فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹ (البقرۃ ۲: ۳۸-۳۹)

> پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

نظریئے کے تین ستون

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کی سب سے کار فرما قوت نظریہ اور ہدایت ہے۔ اس مثالیے (Paradigm) میں تین چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

۱۔ **علم الاشیاء:** یعنی انسان کو اس کائنات کے وسائل اور خزانوں کا علم اور ادراک عطا کیا گیا ہے۔ اسی چیز نے انسان کو دوسری تمام مخلوقات پر فوقیت بخشی اور اسے نیابت و خلافت کا اہل بنایا۔

۲۔ **عقل اور انتخاب کی آزادی:** انسانوں کو عطا کی۔ فرشتوں نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''یہ فساد کرے گا''۔(بقرہ ۲:۳۰) گویا رد و قبول کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جبر میں نہیں کسا بلکہ اس کو آزادی اور انتخاب کی صلاحیت بھی دی ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو سیکولر سوچ اور دینی سوچ میں مشترک ہیں۔ البتہ اس سلسلے کی تیسری چیز (ہدایت) کے بارے میں (جو انسانی زندگی کے لیے انتہائی ضروری ہے) سیکولر سوچ اور دینی سوچ میں بعد المشرقین نظر آتا ہے اور یہیں سے اختلاف کی بنیاد سامنے آتی ہے۔

۳۔ **ہدایت:** سے مراد اس زندگی کو گزارنے کا اسلوب، احساس ذمہ داری کی میزان اور آخرت میں جواب دہی کی ذمہ داری ہے، جس کے لیے انبیاء و رسل علیہم السلام کو بھیجا گیا، کتابوں اور ہدایت کی روشنی دی گئی اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی اس ابدی ہدایت کی تکمیل کی گئی۔ فرمایا:

> **اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝** (البقرۃ ۲:۲۸۵)

''رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی اس ہدایت

کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں، اور اس کی کتابوں، اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، اور ان کا قول یہ ہے کہ: ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک، ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری طرف پلٹنا ہے"۔

مراد یہ ہے کہ ہدایت وہ چیز ہے جو مقصد تک پہنچنے کی تمام تر جدوجہد کو سہارا عطا کرتی ہے، علم کو انسانیت کے لیے نافع اور سودمند بناتی ہے، اور نیابت و خلافت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے رہنمائی عطا کرتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں علم الاشیاء، آزادیِ انتخاب اور ہدایت کے تین ستونوں پر ہی نظریئے، مقصد اور منزل کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر نہ زندگی میں انضباط پیدا ہوتا ہے، نہ اصل جوہرِ انسانیت کا اظہار ہوتا ہے، اور نہ تحریک و تحرک کو کوئی راستہ ہی ملتا ہے۔ اس لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے نظریہ ناگزیر ہے، اور یہ سبھی معاشروں اور انسانوں کے لیے ضروری ہے، جب کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہدایت، انسانی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے جس کے لیے یہ اصول طے کر دیا گیا:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (فاتحہ ۱:۵-۶)

ہمیں سیدھا راستہ دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

تاریخِ انسانی میں نظریہ

انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ جن قوموں اور انسانوں کے سامنے کوئی نظریہ اور منزل تھی، ان ہی نے اوراقِ تاریخ اور دامنِ تہذیب میں نام پیدا کیا۔ نظریہ غلط ہو یا درست، شر پہ مبنی ہو یا خیر کا علم بردار، دونوں ہی

صورتوں میں وہ ہمیشہ زندگی کی نشو و نما اور پیش رفت اور ترقی کے لیے، ایک بنیادی محرک رہا ہے۔ البتہ نظریہ اگر حق پر مبنی ہے تو اس سے انسانی زندگی اور دنیائے تہذیب میں خیر اور فلاح کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اگر وہ باطل پر مبنی ہے تو یہ جہان تنگ و دو فساد کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

تاریخ کے اس فتوے کو ایک طرف تو ابن خلدون (م: ۱۴۰۶ء) نے اپنے انداز میں مقصد شریعت اور عصبیت کے فریم ورک میں پیش کیا ہے، اور دوسری جانب خود دورِ جدید کے فلاسفۂ تاریخ نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر پی اے سارو کن (Pitirim Alexandrovich Sorokin) (م: ۱۹۶۸ء)، آرنلڈ جے ٹائن بی (Arnold J. Toynbee) (م: ۱۹۷۵ء) اور عصرِ حاضر کے دیگر ماہرین تاریخ نے بھی اپنے اپنے انداز میں اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان سب کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ وہی قومیں انسانی تاریخ کے اسٹیج پر ابھری ہیں، جن کے سامنے ایک اعلیٰ نصب العین تھا، اور جو اس نصب العین اور نظریئے کی بنیاد پر فکری، سماجی، معاشی اور نفسیاتی زندگی کے چیلنجوں کا جواب دینے کا داعیہ، صلاحیت اور جذبہ رکھتی تھیں۔ اس چیز کو گذشتہ ربع صدی کے ماہرین تہذیب و تاریخ 'انسانی تہذیب کی تشکیل میں نظریئے اور افکار کی فیصلہ کن کارفرمائی' کے جملے میں پیش کرتے ہیں۔ اسی اصول کو ہمارے اہلِ دانش نے فکری و عملی جدوجہد سے مربوط کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ (م: ۱۷۶۲ء) نے اسے 'اجتہاد اور جہاد' سے تعبیر کیا ہے، اور شعر و ادب نے اسے 'قلم اور تلوار' کی علامات کی شکل میں پیش کیا ہے۔

یہ تاریخ انسانی کا نہایت صاف اور واضح فیصلہ ہے کہ تہذیبی تبدیلی کے لیے فیصلہ کن عامل قلم ہی ہے۔ قلم سے مراد ہے فکر و دانش اور اخلاق و اصول، جب کہ اس تبدیلی کو روبہ عمل لانے اور اس کی حفاظت کے لیے قوت، تنظیم اور تلوار کا وجود ناگزیر ہے۔ یوں قلم اور تلوار انسانی تاریخ، تہذیب اور زندگی کے لیے دست راست اور ایک دوسرے کے زبردست معاون اور پُشتی بان ہیں۔

۲۰ویں صدی ایک طرف بے خدا فلسفوں کے درمیان کش مکش اور دوسری طرف

یورپی قوموں کے درمیان تجارتی و معاشی رقابت کی بنا پر خوں ریز تصادم کی صدی تھی۔اس سے ما قبل متصل 19ویں صدی میں ایوان ترگینف (Ivan Turgenev)(م:۱۸۸۳ء) نے نہل ازم Nihilism (’زندگی ایک بے معنی اور محض وجودی چیز ہے‘) کے نظریئے کو بڑے دعوے سے پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ گذشتہ دو صدیوں میں جواب دہی کے تصور سے بالاانسان کی مزعومہ سوچ کا سرچشمہ اسی فکر سے پھوٹتا ہے۔19ویں صدی کے اواخر میں اشتراکیت اور پرولتاری، یعنی مزدوروں کی آمریت کا نعرہ بلند ہوا، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے وسیع حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے افکار کو تہہ و بالا کر دیا۔ مگر اپنی غیر فطری بنیاد کے باعث ۸۰،۰۷ سال کے بعد ہی اشتراکیت کا سورج ڈوب گیا۔اسی درمیان میں فاشزم (فسطائیت) کا ڈنکا بھی بجا مگر ایک دو عشروں میں ہی یہ انسانی تاریخ کی بدترین اصطلاح بن کر فنا کے گھاٹ اتر گیا۔انسانیت کے ساتھ یہ کتنا بڑا مذاق ہے کہ وہی مغربی تہذیب جس نے ۲۰ویں صدی میں سائنسی ترقی کا سہارا لے کر دو عظیم جنگوں میں کروڑوں انسانوں کو موت کی وادی میں دھکیل دیا تھا، آج مسلمانوں کو امن کا درس دے رہی ہے! پھر سوویت یونین کے انہدام (۱۹۹۱ء) کے بعد فرانسس فوکویاما (Yoshihiro Francis Fukuyama)(پ:اکتوبر ۱۹۵۲ء)نے ”The End of History“ میں گویا نظریاتی تاریخ کے خاتمے کا اعلان کیا اور مگر چند ہی برسوں میں یہ فکر بھی پانی کے بلبلے کی طرح تحلیل ہو گئی۔

دورِ حاضر میں نظریاتی بحران

آج دنیا میں ایک بار پھر نظریات کی بالادستی، مقاصد اور ’اقدار بطور اصل کار فرما قوت‘ کے فہم اور حصول کی پیاس بڑھ رہی ہے۔ عصر حاضر میں پیدا شدہ عالمی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی بحران کا حل ایک بار پھر نظریاتی آدرشوں میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اصل بحران، اخلاقی بحران ہے، نظریاتی شعور کی پستی کا بحران ہے، جس نے انسانی زندگی اور اس کے مستقبل کو خوف ناک چیلنج سے دوچار کر دیا ہے۔

آج اہل فکر و نظر، اقدار اور اخلاق کی کار فرمائی کو زندگی کے فیصلہ کن مظہر کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ انسانیت کا مستقبل اسی وقت روشن قرار دیا جاسکتا ہے، جب ایک ایسا عالمی نظام معرض وجود میں آئے، جو احترامِ آدمیت، اخوت، حریت اور مساوات اور بے لاگ انصاف پر استوار ہو، جو استحصال سے پاک اور انسانوں کے درمیان محبت، امداد باہمی اور مؤدت کا داعی ہو۔ پاکستان کے فکری بانی علامہ محمد اقبال کہتے ہیں:

> وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے، اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل وزبان ورنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت میں سے اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے، اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہو پائیں گے۔ [یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو سالِ نو کا پیغام، آل انڈیا ریڈیو، لاہور]

اسی طرح علامہ محمد اقبال ایک موقع پر لکھتے ہیں:

> جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے، اس کی رو سے اسلام انسان کی محض اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں، بلکہ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر، اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے..... یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ تو قومی ہے، نہ نسلی ہے، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔ اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے

عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے[1]۔

29 دسمبر 1930ء کو خطبہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے یہ بھی فرمایا تھا:

> اسلام، فرد کی زندگی کو دین اور دنیا کے الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتا۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں ہے۔ اسلام کی رُو سے خدا اور کائنات، روح اور مادہ، کلیسا اور ریاست ایک ہی کل کے جزو ہیں، اور ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ انسان اس آلایشوں سے لبریز اور ناپاک دنیا کا کوئی باشندہ ہے اور وہ اسے کسی دوسری دنیا کی خاطر ترک کردے، جہاں روح رہتی ہے، اسلام کے نزدیک مادہ روح کا وہ روپ ہے جو قیدِ مکان و زمان میں گھرا ہوا ہے۔ یورپ کی عیسائی ریاستوں کی زندگی سے مذہب عیسوی تقریباً خارج ہو گیا ہے .... میری خواہش ہے (اور مجھے یقین ہے کہ) شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک منظّم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔

گویا اسلام ان نسلی اور علاقائی امتیازات سے بلند ہو کر انسان کو اس کی فطرت کی جانب بلاتا اور اسے ایک تصورِ جہاں (ورلڈ ویو) کی روشنی دیتا ہے کہ جس کی بنا پر منصفانہ نظامِ جہاں (ورلڈ آرڈر) نموپذیر ہوتا ہے۔

اس وقت جو لوگ نظریئے کی کارفرمائی اور اس کی اہمیت کا انکار کر رہے ہیں، وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ مقصدِ حیات، نظریئے، اخلاقی اور سماجی اقدار سے کٹ کر، اور مفاد و عصبیت کی دلدل میں پھنس کر انسان حیوانیت کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ جتنا وہ نظریئے اور اخلاق سے دور ہوتا ہے، اتنا ہی وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے تباہی و بربادی کا سبب بنتا ہے۔ نہ اس کی قوم پرستانہ جمہوریت، انسانیت کے لیے ہمدردیِ عمل کا پروگرام پیش کرتی ہے

---

[1] مضمون: 'جغرافیائی حدود اور مسلمان'، حرف اقبال (اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اشاعت اول اگست ۱۹۸۹ء ص۔ ۲۲۲، ۲۲۳)

اور نہ ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ انسانیت کے دکھوں کا مداوا کر پاتی ہے۔ ان طرزِ ہائے حکومت کی طرح معاملہ قوموں اور ملکوں کا بھی ہے۔

پاکستان کی نظریاتی اساس: نظریہ پاکستان کو سمجھے بغیر تحریک پاکستان اور اس تحریک کی اصل قوتِ محرکہ کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ پاکستان کے وجود کو سمجھنے کی کنجی تحریک پاکستان کا نظریہ ہے۔ اس مناسبت سے سمجھنا چاہیے کہ مسلمان اور اسلام دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اسلام ہی مسلمانوں کے تشخص کی علامت ہے اور مسلمان ہی اسلام کی پہچان ہیں۔ اس حوالے سے یہ نظریہ کہ: ''مسلمان ہونا تو ٹھیک ہے، مگر اس کا اسلامی ہونا کوئی ضروری تقاضا نہیں ہے''، ایک احمقانہ اور تباہ کن تصور ہے۔ مسلمان اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک اُمت کا حصہ ہے، ایک مشن اور مقصد کا علم بردار ہے، جسے مسلمانیت کی پہچان نے ایک خاص ذمہ داری سونپ دی ہے۔ مسلمان گناہ گار ہو سکتا ہے، مگر وہ اسلام کے تصور جزا و سزا، اور اُخروی جواب دہی کے تصور سے اپنے آپ کو الگ کر لے یا اس کی مسلسل نفی کرے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس لیے عقیدہ ہی اول و آخر مسلمان کی پہچان ہے۔

یہ عقیدہ انسان کے ذہن میں تین بنیادی تصورات راسخ کر دیتا ہے:

۱۔ غیر اللہ سے بغاوت۔

۲۔ اللہ پر ایمان اور اس کے سامنے مکمل سپردگی۔

۳۔ زندگی گزارنے کے لیے اللہ، رسولؐ، قرآن اور آخرت پر ایمان اور قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق زندگی کو ڈھالنے کی جدوجہد

یہ تینوں تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہی مسلم اُمت کی بنیاد ہیں، اور اسی مناسبت سے ہر مسلمان مرد اور عورت کی شناخت متعین ہوتی ہے۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ جس چیز کو 'دو قومی نظریہ' کہا جاتا ہے یہ ہندوستانی

مسلمانوں کی اختراع نہیں ہے، بلکہ وہ پہلے دن سے اسلام کے ایمانی، فکری، تہذیبی تصورات اور اہداف کو قائم کرنے والا نظریہ ہے۔ سورۂ فاتحہ دو قوموں اور دو امتوں کے خدوخال واضح کرتی ہے، فرمایا:

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ ۙ۬ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ۝

قرآن کریم کا یہی افتتاحیہ اس دو قومی نظریئے کو وجود بخشتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہمیشہ سے دو راستے متعین کر کے، انسانوں کو ردو قبول کا اختیار دے دیا گیا ہے، یعنی ایک سیدھا راستہ اور دوسرا اس کے برعکس الٹا راستہ۔ ایک راستہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں سے تشکیل پاتا ہے، اور دوسرا راستہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے انکار، مخالفت یا اپنی خواہشات کی پیروی سے منسوب ہے۔ اس دو قومی نظریئے میں جو بنیادی حقیقت بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ انسانیت دراصل انھی دو بنیادی قافلوں پر مشتمل ہے۔ ان دونوں قافلوں میں فکر، صورت، ہیولا، شکل اور منزل جدا جدا ہے۔ ایک قافلہ انبیا علیہم السلام کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا ہے اور دوسرا انحراف اور بغاوت کو اپنائے ہوئے ہے۔

اس نظریئے کے تین مضمرات ہیں جن کا سمجھنا ازبس ضروری ہے:

- پہلا یہ کہ افراد اور اقوام کو اس امر کی آزادی حاصل ہے کہ وہ کون سی منزل اور کس نظریئے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسی انتخاب کے مطابق وہ اجتماعی زندگی میں نتائج بھگتیں گے اور انفرادی طور پر آخرت میں جواب دہ ہوں گے۔
- دوسرا یہ کہ ہر قوم کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنے تصور اور منزل کے انتخاب کے مطابق اپنے تشخص اور تہذیبی اور معاشرتی دروبست کا انتظام و انصرام کرے، اور اس میں مسابقت و بہتری کے امکانات کو بروئے کار لائے۔
- تیسری جہت انسانی زندگی کے اُس پہلو سے وابستہ ہے، جس کا ذریعہ ہدایت الٰہیہ ہے۔ صرف اس ایک پہلو سے جو عقیدے پر مبنی ہے، اس میں تو لازماً یک رنگی ہے، تاہم

احوال و ظروف اور زمان و مکان کی مناسبت سے، اس عقیدے کے تحت یک سو اور باہم مربوط ہوتے ہوئے، افراد اور ممالک کے لیے کثرتیت کی گنجائش پوری طرح موجود ہے۔ اسلام نے اس جزوی اختلاف اور تنوع کو اللہ اور اس کے آخری رسولؐ کے پیش کردہ ضابطے کے فریم ورک میں اختیار کرنے اور راستے نکالنے کی اجازت دی ہے۔

یہی چیز ہے دو قومی نظریئے کی اساس اور وسیع تر بنیاد۔ اسی بناپر ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ تصور حیات اور الہامی ہدایت کی بنیاد پر دنیا میں علم پھیلائے، رہنمائی دے اور دوسروں کے لیے قابل اتباع نمونہ پیش کرے۔ اسی طرح یہ دو قومی نظریہ یہی حق دوسروں کو بھی دیتا ہے کہ وہ اپنے تصورات و عقائد کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات کو چلائیں۔ یہ نظریہ مغرب کے قومی ریاستوں (Nation states) کے تصور سے بالکل مختلف سوچ کا حامل ہے۔ اس میں قومی ریاست کا نہیں بلکہ قوموں کی ریاست کا تصور ہے جس میں یہ اہتمام موجود ہے کہ ہر قوم کو اپنے تشخص کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے، تاہم جس کو بالادستی حاصل ہے، اس کی یہ اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیت کے لیے آسودگی پیدا کرے اور اس کے حقوق کا تحفظ کرے۔ اس فریم ورک کی مختلف اور متنوع صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں، مگر ان میں مسلمانوں کے لیے تین کو مرکزیت حاصل ہے:

۱۔ وہ ملک، جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے اور اس میں انھیں اقتدار بھی حاصل ہے۔

۲۔ وہ ملک جس میں مسلمانوں کی اکثریت تو ہے، مگر اقتدار سے بے دخل ہیں۔

۳۔ وہ ملک، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور انھیں اقتدار بھی حاصل نہیں ہے۔

پہلی صورت میں اسلامی نظریئے کا تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا نظام، اسلام کی روشنی میں وضع کیا جائے جس میں اکثریت نظام زندگی اور منزل کو متعین کرے اور دوسری تمام اقوام کو انفرادی، تہذیبی اور اجتماعی حقوق حاصل ہوں، تاکہ وہ اس نظریاتی ریاست میں

اپنے مذہبی اور نظریاتی تشخص کے لیے مناسب جگہ (Space) پا سکیں۔ اس طرح اکثریت اور اقلیت، دونوں عدل و انصاف اور افہام و تفہیم کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

دوسری صورت میں مسلمانوں کی فطری طور پر خواہش اور کوشش ہوگی کہ وہ اپنی اکثریت کو اختیار اور اقتدار دلانے کے لیے جدوجہد کریں۔ یہ ان کا جائز حق ہے۔ اگر انھیں اس میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ پہلی صورت میں آجاتے ہیں۔ ورنہ جدوجہد کے مرحلے میں شامل رہتے ہیں۔

رہی تیسری صورت، تو اس میں اسلام نے یہ بات قبول کی ہے کہ جن کو اکثریت اور اقتدار حاصل ہے، انھیں اجتماعی زندگی میں انصاف اور دوسروں کے حقوق کی پاس داری کے ساتھ حکمرانی کا موقع ملنا چاہیے۔ دوسرے مذہبی اور تہذیبی تشخص کے حاملین کو قرار واقعی جگہ اور سہولت حاصل ہونی چاہیے، تاکہ وہ باوقار اور منصفانہ انداز سے زندگی گزار سکیں۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں دو قومی نظریہ انسانی تاریخ و تہذیب اور زندگی سے مطابقت رکھتا ہے، تاہم حالات کی مناسبت سے اس میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے۔ اس نظریاتی فریم ورک میں برعظیم پاک و ہند کے حالات کا جائزہ لیں تو صاف نظر آتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ۹۰۰ سالہ دور حکمرانی میں اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ وہ بڑی حد تک شریعت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک کارفرما قوت بنانے کا اہتمام کریں۔ انھیں اس میں کامیابیاں بھی ملیں اور ناکامیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس طرزِ احساس کا منہ بولتا ثبوت اس خطۂ ارضی میں تجدیدِ دین اسلام کی متعدد تحریکیں ہیں، مگر اس تمام تر احساس کے باوجود خطۂ ہند کی تاریخ یہ ثبوت پیش نہیں کرتی کہ مسلمانوں نے جبر اور قوت کے ذریعے یہاں بسنے والی اکثریت کو اپنے مذہب، اپنی زبان اور اپنے تہذیب و تمدن کو تبدیل کرنے پر کبھی مجبور کیا ہو، بلکہ اس کے برعکس انھیں اس چھتری کے تحت پوری آزادی کے ساتھ اپنے عقیدے اور تہذیب کے مطابق زندگی گزارنے کا پورا پورا موقع دیا اور اجتماعی امور میں معاشرے کے تمام طبقوں کو برابر کے مواقع میسر رہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے ہندوستان کی تاریخ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندومت کے پیروکاروں کو جب بھی اقتدار ملا، انھوں نے دوسرے مذہب کو نیست و نابود کیا۔ اس کے پیروکاروں کو ملک بدر کیا یا اپنے نظام میں تحلیل کرنے کے لیے ہر ناجائز کوشش کی، یا ان کی انفرادی شناخت کو ختم کر کے دم لیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی ۹۰۰ سالہ بالادستی کے زمانے کا ریکارڈ پوری دنیا کے سامنے موجود ہے، اور ان لوگوں کے پاس بھی موجود ہے جنھیں 'ہندو سیکولرازم' میں 'روشن خیالی' کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ اس زمانے کا ریکارڈ گواہی دیتا ہے کہ مسلمانوں نے سیاسی غلبے کے باوجود دوسرے مذاہب کی شناخت کو ختم کرنے یا ان کے پیروکاروں کو اس مناسبت سے شہری حقوق سے محروم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی (البتہ متحارب اور جنگ میں مصروف عناصر کا معاملہ دوسرا ہے)۔ یوں سرزمین ہند پر مسلم دور حکومت میں تمام افکار و مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ باغ کے مختلف اور رنگارنگ پھولوں کی طرح پھلتے پھولتے اور اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

بعدازاں برطانوی استعمار کے قبضے کے اولین دور میں شعوری طور پر، ہوشیاری اور چابک دستی کے ساتھ، اس نوآبادیاتی طاقت نے کوشش کی کہ یہاں مسلمانوں کو کمزور اور غیر مؤثر بنادیں کیونکہ انھیں اصل چیلنج مسلمانوں سے تھا، جن سے انھوں نے اقتدار چھینا تھا اور اسی مناسبت سے ہندو نفسیاتی طور پر برطانوی استعمار کے حلیف تھے۔ اسی استعمار نے سیاسی، تہذیبی اور معاشی اعتبار سے اپنے ہم نواؤں کی ایک قوت تیار کی جس کے لیے عیسائی مشنری قوتوں، جدید تعلیم کی تحریک اور دوسرے تمام سرکاری وسائل استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی بالادست قوت کو ہر ممکن سہولت مہیا کی۔ دوسری طرف مسلمانوں کا ایک مراعات یافتہ طبقہ پیدا کیا، جو دورِ غلامی میں انگریزوں کا وفادار، اور مسلمانوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ بنا رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس طبقے نے اپنے اس کردار کو پوری وفاداری سے انجام دے کر ملک کو نظریاتی کشمکش اور تہذیبی انتشار کی دلدل میں دھکیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہندوستان میں چونکہ مسلمانوں کی آبادی تقریباً ایک

چوتھائی تھی اور ہندو غالب اکثریت رکھتے تھے، اس لیے بھی ہندوؤں کو اجتماعی نظام میں بالادستی دی گئی۔ اس پس منظر میں تحریک آزادی اُبھری۔

انگریزوں کے اس دور حکمرانی میں جو پہلی عوامی تحریک زبان زدِ خاص و عام ہوئی، جس کی بازگشت سمندر پار بھی سنی گئی اور جس نے اہلِ ہند میں ایک عوامی شعور بیدار کیا، وہ تحریکِ خلافت تھی۔ اس تحریک کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ تب مسلمان دو قومی نظریئے کی روشنی میں اپنے سیاسی حقوق اور نظریاتی و تہذیبی تشخص کو ہندوستان کے اجتماعی وجود ہی میں حاصل کرنے کی کوشش شروع کر چکے تھے۔ اس ضمن میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام، مسلم شناخت کا تحفظ، حقوق کا حصول، سیاسی جدوجہد میں نظم و ضبط کا احساس اور تقسیم اختیارات بنیادی ستون کا درجہ رکھتے تھے۔ مسلم لیگ کے قیام ہی نے وفاقی اور صوبائی اختیارات کی بحث کو ایک رخ دیا۔ اس کے مقابلے میں انڈین نیشنل کانگرس اختیارات کی مرکزیت چاہتی تھی۔ سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ میں کانگریس کی اس سوچ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت قائم شدہ کانگریس کی صوبائی حکومتوں نے مسلمانوں کا جو حشر کیا، وہ ٹھیک اسی طرز عمل کا ایک عکس تھا جسے اپنے دورِ اقتدار میں ہندوؤں نے جین مت اور بدھ مت کے ماننے والوں سے روا رکھا تھا۔

یہ تھا منظر نامہ تیسری صورت (یعنی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے) کے حوالے سے جسے مسلمانوں نے دوسری صورت میں ڈھالتے ہوئے (یعنی تشکیل پاکستان کے ذریعہ مسلم اکثریتی ملک کا قیام) آگے بڑھنے اور پھر نمبر ایک میں تبدیل کرنے کی منزل (یعنی مسلمان اکثریتی ملک میں مسلمانوں کے اقتدار) کا انتخاب کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور (جسے ہندوؤں نے قرارداد پاکستان کا نام دیا) دراصل اُس راستے کا سنگ میل ہے، جس کی طرف کانگریس کی تنگ نظری نے مسلمانوں کو دھکیلنے کے لیے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس چیز نے تہذیبی شناخت کے لیے دو قومی نظریئے کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کے ذہنوں میں اتارا اور دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔

دو قومی نظریہ، اقبالؒ اور قائداعظمؒ: اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ علامہ محمد اقبال کے خطبہ الٰہ آباد (۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء) کو غور سے دیکھا جائے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے زمانے میں مسلمان مفکرین، سیاست دان، علمائے کرام اور دانش ور ایک گہرے اضطراب کا شکار تھے، پھر حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کا ہدف محض برطانوی سامراج سے آزادیِ محض کا حصول نہیں ہے، بلکہ وہ یہ آزادی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کی یہ آزادی دوسرے عقائد رکھنے والوں کے لیے بھی امن و آشتی کی نوید ثابت ہوگی۔

آزادی کے اس تصور کو ایک طاقت ور جذبے کی شکل ۱۹۰۶ء سے ۱۹۳۸ء کے درمیانی عرصے کے معروضی حالات نے دی۔ یہ بات طے ہوگئی کہ ایک تنگ نظر اکثریت سے آزادی حاصل کرکے مسلم ریاست کا قیام لازم ہے۔ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم کے مابین جو خط کتابت ہوئی، اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان آل انڈیا مسلم لیگ نے جو قراردادیں منظور کیں، اور ان میں جو مسائل نمایاں کیے گئے، اگر دیانت داری سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو صرف ایک ہی نتیجہ سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ اپنے دینی، نظریاتی، تہذیبی، سیاسی اور معاشی تشخص اور مستقبل کو محفوظ کرنے اور اسے ترقی دینے کے لیے مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ مسلم ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یوں احساس اور سوچ جب عمل میں تبدیل ہونا شروع ہوئی تو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک اپنے ۱۰۰ سے زیادہ بیانات میں اسلامی نظریئے، اسلامی تہذیب، اسلامی قومیت، اسلامی تشخص، اسلامی قانون، اسلامی کلچر، اسلامی تاریخ اور اسلامی معاشرت کا ذکر کیا ہے۔

قائداعظم نے ہندو قوم پرست لیڈر گاندھی جی (م: ۱۹۴۸ء) کے نام اپنے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۴ء کے خط میں لکھا تھا:

قرآن مجید مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی، مجلسی، دیوانی، فوجداری، عسکری، تعزیری، معاشی، سیاسی اور معاشرتی غرض یہ کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ کے امورِ حیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، اخلاق سے لے کر انسدادِ جرم تک، زندگی میں جزا اور سزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا تک۔ یہ ہر قول و فعل اور ہر حرکت کے احکامات کا مجموعہ ہے۔

اس پس منظر میں قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرنا اور اس کی بنیاد پر یک سر مختلف استدلال گھڑنا، قائدِ اعظم کے ساتھ سخت ناانصافی اور علمی اعتبار سے سراسر بد دیانتی ہے۔ خود قائدِ اعظم نے باندازِ دگر اس تقریر کی تین مرتبہ وضاحت کی۔ ہم یہاں قائدِ اعظم کا ایک بیان اور تین تقاریر پیش کر رہے ہیں۔ بیان ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء سے ڈیڑھ ماہ قبل کا ہے اور تقریریں ۱۱ اگست کے بعد کی ہیں۔

تحریک پاکستان کے زمانے میں کانگریس کے حامی، قیامِ پاکستان کے مخالف، متحدہ قومیت کے طرف دار اور 'روشن خیال'، مسلمان رہنماؤں میں ایک نمایاں نام خان عبدالغفار خاں (م: ۱۹۸۸ء) کا تھا۔ انھوں نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان تقسیم کے بعد اپنا موقف تبدیل کرتے ہوئے ۲۳ جون کو کہا: ''جملہ پٹھانوں کے لیے ایک آزاد پٹھان ریاست قائم کی جائے۔ اس ریاست کا دستور جمہوریت کے اسلامی تصورات، مساوات اور معاشرتی انصاف کے مطابق وضع کیا جائے۔ جملہ پٹھانوں سے اپیل ہے کہ وہ اس محبوب منزل کے حصول کے لیے متحد ہو جائیں اور کسی غیر پختون غلبے کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں'' اس کے جواب میں ۲۸ جون ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی سے قائدِ اعظم نے ایک طویل بیان جاری کیا:

> اس سے قبل اس نوع کا پرفریب اور عیارانہ مطالبہ خان برادران یا کسی اور کی جانب سے پیش نہیں کیا گیا کہ سارے پختونوں کے لیے آزاد پٹھان ریاست قائم کی جائے۔ ان کا دوسرا نعرہ دورنگا ہے، اور اس کا مقصد بھی پٹھانوں کو گمراہ کرنا

ہے۔جب وہ یہ کہتے ہیں کہ مجوزہ پٹھانستان کا دستور جمہوریت کے اسلامی تصورات، مساوات اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہوگا، توان کا مطلب، مجلس دستور ساز پاکستان، جو مسلمانوں کی عظیم اکثریت پر مشتمل ہوگی، پر یہ بہتان طرازی کرنا ہے کہ وہ جمہوریت کے اسلامی تصورات مساوات و معاشرتی انصاف کو نظرانداز کردے گی۔ یہ محض ایک عیارانہ حربہ ہے جس کا مقصد شمال مغربی سرحد کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا ہے۔ خان عبدالغفار خاں جو سرحدی گاندھی کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، ان کو اسلامی تصوراتِ مساوات و معاشرتی انصاف پر اجارہ داری حاصل نہیں ہے۔ یہ اچانک اور نئی قلابازی خالصتاً سیاسی عیاری اور ایک حربہ ہے۔ خاں برادران نے اخبارات میں ایک اور زہریلا نعرہ بلند کیا ہے کہ مجلس دستور ساز پاکستان شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین کو نظرانداز کردے گی۔ یہ بھی بالکل نادرست بات ہے۔ ۱۳ سے زیادہ صدیاں بیت گئیں، اچھے اور برے موسموں کا سامنا کرنے کے باوصف ہم مسلمان نہ صرف اپنی عظیم اور مقدس کتاب قرآن کریم پر فخر کرتے رہے، بلکہ ان تمام ادوار میں جملہ مبادیات کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ معلوم نہیں کہ خان برادران کو اچانک اسلام اور قرآنی قوانین کی علم برداری کا دورہ کیسے پڑا ہے۔ اور انھیں اُس ہندو مجلس دستور ساز پر اعتبار ہے جس میں ہندوؤں کی ظالمانہ اکثریت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبہ سرحد کے مسلمان واضح طور پر یہ سمجھ لیں کہ وہ پہلے مسلمان ہیں اور بعد میں پٹھان"۔ [قائداعظم: تقاریر و بیانات، ج۴، ترجمہ اقبال احمد صدیقی، بزم اقبال، لاہور، ص ۳۴۶-۳۴۷]

اس بیان میں قائداعظم نے خصوصاً دو چیزوں کو وضاحت سے نمایاں کیا ہے۔ ایک یہ کہ سیکولر، روشن خیال اور اکھنڈ بھارت کے طرف دار پرلے درجے کے موقع پرست ہیں، اور دوسرا یہ کہ اسلام، نسلی اور علاقائی تفریق سے بالاتر ہے۔ اسی لیے انھوں نے کہا کہ آپ پہلے

مسلمان اور پھر پٹھان ہیں۔ یہی چیز دو قومی نظریئے کی جان ہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام میلاد النبیؐ کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

> میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لوگوں کا ایک طبقہ جو دانستہ طور پر شرارت کرنا چاہتا ہے، یہ پروپیگنڈا کر رہا ہے کہ پاکستان کے دستور کی اساس شریعت پر استوار نہیں کی جائے گی، حالانکہ آج بھی اسلامی اصولوں کا زندگی پر اسی طرح اطلاق ہوتا ہے، جس طرح تیرہ سو برس پیش تر ہوتا تھا، اسلام اور اس کے اعلیٰ نصب العین نے ہمیں جمہوریت کا سبق پڑھایا ہے۔ اسلام نے ہر شخص کو مساوات، عدل اور انصاف کا درس دیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ ایک عظیم راہبر تھے، آپؐ ایک عظیم قانون عطا کرنے والے تھے، آپؐ ایک عظیم مدبر تھے، آپؐ ایک عظیم فرماں روا تھے، جنھوں نے حکمرانی بھی کی۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو بہت سے لوگ اس بات کو نہیں سراہتے۔ اسلام نہ صرف رسم و رواج، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ ہے، بلکہ ہر مسلمان کے لیے ایک ضابطہ بھی ہے، جو اس کی زندگی اور اس کے رویئے بلکہ اس کی سیاست اور اقتصادیات وغیرہ پر محیط ہے۔ یہ وقار، دیانت، انصاف اور سب کے لیے عدل کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی ہے۔ ایک خدا اور خدا کی توحید، اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ [ایضاً، ص ۴۰۲-۴۰۳]

اس خطاب میں قائداعظم نے برملا اعلان کیا ہے کہ جو لوگ اسلامی نظریہ حیات کے حوالے سے پاکستانی مسلمانوں کی یکسوئی کو ابہام و انتشار کا نشانہ بنا رہے ہیں، وہ شر انگیز عناصر ہیں۔ قائداعظم تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی اسی طرح اسلام کے قانون شریعت کو قابل عمل قرار دیتے ہوئے اس پر زور دے رہے ہیں۔ فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام ریڈیو نشری پیغام میں قائداعظم نے فرمایا:

مجلس دستور ساز پاکستان کو ابھی پاکستان کے لیے دستور مرتب کرنا ہے۔ مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ دستور کی حتمی شکل کیا ہوگی، لیکن مجھے اس امر کا یقین ہے کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا، جس میں اسلام کے لازمی اصول شامل ہوں گے۔ آج بھی ان اصولوں کا عملی زندگی پر اطلاق ویسے ہی ہو سکتا ہے، جیسے کہ ۱۳ سو برس قبل ہو سکتا تھا۔ اسلام نے ہر شخص کے ساتھ عدل و انصاف کی تعلیم دی ہے۔ ہم ان شان دار روایات کے وارث ہیں، اور پاکستان کے آئندہ دستور کے مرتبین کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے باخبر ہیں۔[ایضاً، ص ۴۲۱، ۴۲۲]

امریکی عوام کے نام اس نشریئے میں وہ صاف لفظوں میں بتاتے ہیں کہ ۱۳ سو برس قبل جس طرح اسلام کے اصولوں کا اطلاق ہوا تھا، ویسا ہی آج بھی ہو سکتا ہے، اور ریاستِ پاکستان کے دستور میں انھی اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب سے خطاب میں انھوں نے کہا:

مغربی اقدار، نظریئے اور طریقے، ایک خوش و خرم اور مطمئن قوم کی تشکیل کی منزل کے حصول میں ہماری مدد نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنے مقدر کو سنوارنے کے لیے اپنے ہی انداز میں کام کرنا ہوگا، اور دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرنا ہوگا، جس کی اساس انسانی مساوات اور معاشرتی عدل کے سچے اسلامی تصور پر استوار ہو۔ اس طرح ہم مسلمان کی حیثیت سے اپنا مقصد پورا کر سکیں گے، اور بنی نوع انسان تک امن کا پیغام پہنچا سکیں گے۔[ایضاً، ص ۵۰۱]

اس بیان میں انھوں نے مستحکم لہجے میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ مغربی دانش ہمارے مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے اسلامی نظریئے کی بنیاد پر ہمیں اپنا معاشی نظام بھی پیش کرنا ہوگا۔

آخر میں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ ۱۱ اگست کی تقریر میں قائداعظم غیر مسلموں

کے شہری حقوق کی بات کر رہے تھے[1]، نہ کہ تحریک پاکستان کے بنیادی استدلال اور مؤقف کی نفی کر رہے تھے۔ البتہ پاکستان کے سیکولر دانش وروں اور بھارت کے مصنفین نے قائدِاعظم کے تمام خطبات کو نظر انداز کر کے فقط اس ایک تقریر کو بنیاد بنا کر اس سے بالکل ہی دوسرا مفہوم اخذ کر لیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان 'روشن خیال' دانش وروں کو دیانت کا دامن تھامنا اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ دینا چاہیے۔

آج کا چیلنج: قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں ہمیں ایک نظریاتی چیلنج در پیش تھا، آج پھر اس مسئلے کو زیادہ شدت کے ساتھ ابہام کا شکار کیا جا رہا ہے۔ کل اس کے علم بردار خود پاکستان میں چند سیکولر اور اباحیت پسند تھے، اور آج بھارت سے لے کر امریکا تک اس منفی پروپیگنڈے کے پشتی بان ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم پوری یک سوئی کے ساتھ اپنے نشانِ منزل پر نظریں جما کر اس منزل کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

کہا جاتا ہے کہ اس نظریاتی بحث میں پڑنے سے بھلا کون سا مسئلہ حل ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکولر لابی نے اسی دینی اور نظریاتی رشتے کو کمزور بنانے کے لیے وہ سارا جال بُنا جس کے نتیجے میں پاکستان کی نظریاتی اساس سے ہاتھ دھونا کوئی بڑا خسارہ نہیں سمجھا جا رہا ہے۔ حالانکہ سیانا دشمن اسی جڑ پر تیشہ چلا رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک پاکستان کے دینی اور آئینی رشتے کو نشانہ بنا کر توڑ پھوڑ نہیں دیا جائے گا اس وقت تک اس مملکتِ خداداد کی تخریب ممکن نہیں ہو گی۔ اندریں حالات تمام اہلِ وطن کی ذمہ داری ہے کہ وہ پاکستان کی اس پہچان اور رشتے کو سمجھیں، اس کی حفاظت کریں اور اس کی بنیادوں پر اپنے سماجی، تہذیبی، معاشی اور

---

[1] قائدِاعظم محمد علی جناح کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی پارلیمنٹ میں تقریر کے وہ جملے درج ذیل ہیں:

"You are free; you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other place of worship in this State of Pakistan. You may belong to any religion or caste or creed that has nothing to do with the business of the State".

سیاسی مستقبل کی تعمیر کریں۔

یاد رہے کہ آج پاکستان جن مسائل میں گھرا ہوا ہے، اس کا واحد حل دو قومی نظریئے کی بازیافت اور اسلامی نظریۂ حیات کے لیے مکمل یکسوئی میں پوشیدہ ہے۔ امریکا کی یلغار، داخلی انتشار، بلوچستان کا قضیہ، مہنگائی کا عفریت اور سیاسی، معاشی اور اخلاقی بحران، ان سب کا علاج اسی سے ممکن ہے۔ نیت ٹھیک نہ ہو تو اسے محض ایک نظری بات کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے لیکن اگر نیت درست ہو تو اسلام کی یہ رہنمائی اور بانیانِ پاکستان علامہ اقبال و قائداعظم کی یہ پکار الجھی راہوں کو صراط مستقیم بنادے گی۔

(اکتوبر ۲۰۰۹ء)

نظریاتی اساس: بنیادیں، رکاوٹیں اور اقدامات

قیام پاکستان کے مقاصد اور بنیادوں کے حوالے سے سیکولر اور لبرل طبقات نے ابتداء ہی سے غلط فہمیاں اور فکری انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی اور نفاذ شریعت کے معاملے کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ کبھی فرقہ وارانہ مسائل اور کبھی جغرافیائی و تاریخی بنیادوں پر اسلام کی توضیحات کو پیش کر کے سوالات اٹھائے گئے۔ سیاسی رہنماؤں، حکمران طبقات کی بات تو الگ ہے نظام عدل پر فائز اہل حکم بھی تضاد فکری کا شکار ہے۔

سینیٹر پروفیسر خورشید احمد نے اپنے زیر نظر مضمون میں ان اقدامات کو بیان کیا جو پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے ضروری ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ پالیسی ساز اداروں کی تشکیل نو اور ان سے رابطہ و تعاون کیوں ضروری ہے تمام ہی اداروں میں ہر سطح پر قیادت کی تبدیلی سے کیسے بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں اور وہ کونسا نظام تعلیم و تربیت ہے جو وطن عزیز کو شریعت کی بنیادوں پر چلانے کے لیے ضروری ہے۔

اس وقت ملک و ملّت کے تقریباً ہر طبقے میں اور ہر میدانِ کار میں چند بنیادی مسائل پر بحث و گفتگو کا سلسلہ گرم ہے۔ نجی محفلوں، سیاسی اجتماعات اور اخبارات و رسائل کے صفحات سے لے کر پارلیمنٹ کے ایوانوں تک ہر جگہ یہی مسائل زیرِ بحث ہیں: امن و امان کی زبوں حالی، معاشی بحران، علاقائی عصبیت کی زہرناکی، فرقہ واریت کے عفریت کی کارفرمائیاں، لوٹ کھسوٹ کی ہوش ربا داستانیں، خارجہ سیاست میں پاکستان کی آزمائش، بھارت کے جارحانہ عزائم کی افزونی، امریکا کی بے وفائیاں اور اندرونی قلابازیاں و ریشہ دوانیاں سرفہرست ہیں۔

اس پس منظر میں تحریکِ اسلامی نے قوم اور اس کی قیادت کو یہ سوچنے کی دعوت دی ہے کہ ان مسائل کے حقیقی اور دیرپا حل کے لیے فکر و نظر کے جس انقلاب اور جس مضبوط اور ہمہ گیر ملّی اقدام کی ضرورت ہے، وہ نفاذِ شریعت ہے، مگر بدقسمتی سے ہماری سیاسی اور انتظامی قیادتوں نے اس مسئلے کو ہمیشہ ایک متنازع مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ساری توجہ شریعت کی کلید سے زندگی کے مسائل حل کرنے سے ہٹ کر سیاسی اور قانونی موشگافیوں ہی پر نہیں، بلکہ نیتوں کے فتور اور انفرادی اور گروہی اقتدار کی شرم ناک جنگ پر مرکوز ہو گئی ہے۔ یہ مقتدر طبقہ جو خواہ اپنی تعداد اور عوامی بنیاد کے اعتبار سے کتنا ہی قلیل اور غیر ثقہ کیوں نہ ہو، مگر سیاسی اثرات، ذرائع ابلاغ میں اپنی قوت اور بیرونی تائید و معاونت کے اعتبار سے بڑا زور آور ہے، کھل کر اسلام، اسلامی ریاست، شریعت کی بالادستی اور اجتماعی زندگی میں دین کے کردار ہی پر حملہ آور ہے۔

ان حالات میں ضرورت ہے کہ اس شور و غوغا میں اس بنیادی مسئلے کو گم ہو جانے سے بچایا جائے۔ ہر جماعتی، گروہی اور ذاتی اختلاف، مفاد اور تعصب سے بالا ہو کر نفاذِ شریعت کی حقیقت کو سمجھا جائے اور اسے حقیقت بنانے کے لیے جس طرزِ فکر، طریق کار اور عملی اقدام کی ضرورت ہے، اس کی نشان دہی کی جائے تاکہ شریعت [جو نام ہے دین اسلام اور اس کے دیئے ہوئے طرزِ فکر و عمل کا، اور جس کی امتیازی خصوصیت ہی حضور پاک ﷺ نے یہ بتائی ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ منزلِ مقصود تک لے جانے والا (حنیفیه)، نرمی اور آسانی پیدا کرنے والا (سمحه)، سہولت بخش (سهله)، منور، تابناک (بیضاء)، اور اتنا واضح ہے کہ اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے (لیلھا کنھارھا)] عملاً نافذ ہو۔

غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں

آگے بڑھنے سے پہلے ہم ان چند بنیادی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرنا چاہتے ہیں جو اس بحث میں بڑے بڑے جغادری اور بااثر افراد کی طرف سے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہیں۔

سب سے افسوس ناک اور باغیانہ رویہ ملک کی سیکولر اور غیر مسلم لابی کا ہے۔ یہ لابی کھل کر اسلامی ریاست اور شریعت کی بالادستی کے خلاف محاذ آرائی میں پیش پیش ہے اور بڑے تند اور تلخ انداز میں جارحانہ طور پر حملہ آور ہے۔ اس میں انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق کا نام لینے والے منظم گروہ اور ایک وہ گروہ بھی شامل ہے جو اپنے آپ کو 'دین کی جدید تعبیر' کا حق دار قرار دے کر نئی نئی موشگافیاں پھیلاتا اور لمحہ بہ لمحہ موقف تبدیل کرتا دکھائی دیتا ہے (اس گروہ میں اور منکرینِ سنت میں بس دو چار ہاتھ کا فرق ہے۔) یہ سبھی ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

وزیراعظم (نواز شریف) نے کھل کر مذموم لبرل ازم سے نسبت جوڑنے کا اعلان کیا ہے۔ پاکستان میں حقوقِ انسانی کے نام پر ہنگامہ برپا کرنے والا پورا طائفہ ہر طرف اپنی توپیں داغ رہا ہے اور مسلمانوں کو ان کے اپنے ملک میں ان کی اپنی شریعت نافذ کرنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور بے سروپا پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغربی ذرائع ابلاغ اور پالیسی ساز، جمہوریت اور اکثریت سے فیصلوں کے سارے دعووں کے اصول کو تسلیم کرنے کا دم بھرنے والے اس معمولی سی اقلیت کی آواز میں آواز ملا رہے ہیں اور اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

ایک دوسرا طبقہ ذرا مختلف انداز میں کرم فرما ہوا ہے۔ اسے کھل کر سیکولرازم، لبرل ازم اور لادینیت کی بات کرنے کی توہمت اور جرأت نہیں۔ اس لیے اس نے ایک خیالی خطرے کا ہوّا اُٹھایا ہے، یعنی اس کا نشانہ نام نہاد مذہبی پیشوائیت، تھیوکریسی اور 'مُلّا کا اسلام' ہے اور 'اقبال اور قائداعظم کے اسلام' کا نام لے کر یہ نفاذِ شریعت کی راہ کھوٹی کرنا چاہتا ہے۔

اندریں حالات ملک کے عوام اور اس کی اسلامی قیادت کو اصل سوال، یعنی شریعت کی بالادستی کے قیام کی تحریک کو، خواہ وہ کسی بھی سمت سے آئے اور کسی بھی شکل میں ہو، تقویت پہنچانے اور اس مسئلے کو دستوری اور قانونی اعتبار سے ایک بار مکمل طور پر طے کرا لینے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا اور تحریکِ پاکستان کے حقیقی

مقاصد کو پورا کرنااور ان قربانیوں کا حق ادا کرنا ہے جو پاکستان کو دورِ حاضر میں اسلام کی حقیقی تجربہ گاہ بنانے کے لیے برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں نے دی تھیں اور جس کے لیے تحریک اسلامی نے ۱۹۴۸ء میں مطالبہ نظامِ اسلامی[1] کی آواز بلند کی اور اس دن سے لے کر آج تک شریعت کی بالادستی اور دین حق کی اقامت کے لیے جدوجہد کی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے مالک وآقا اور رب کو تسلیم کرے یا نہ کرے اور اپنے لیے اللہ کی بندگی یا اس سے بغاوت کا راستہ اختیار کرے (اور یہی معنی ہیں: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کی ضمانت کے) تو بلاشبہ ہم یا کوئی مسلمان ملک انسانوں کو ان کے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔ لیکن دو باتیں صاف ہونی چاہییں:

- جہاں کفر اور انکار کی راہ اختیار کرنے والوں کو اپنے ذاتی عقیدے اور عمل کی آزادی کا اختیار حاصل ہے، وہاں انھیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو، جو اپنے عقیدے اور ایمان کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن وسنت کی بالادستی کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں، اس عمل سے روکیں اور اس کے لیے بیرونی، سیاسی اور تہذیبی قوتوں کی معاونت سے زور آوری کا ہر حربہ استعمال کریں۔ سیکولر

[1] دستور ساز اسمبلی سے سیّد مودودی کا چار نکاتی مطالبہ نظامِ اسلامی۔۱۹۴۸ء: چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے۔ چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اس خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا اب قیامِ پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں منسوخ کیے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔

لابی جو دوسروں کو 'مذہبی فسطائیت'، 'انتہاپسندی' اور 'عدم برداشت وغیرہ کا طعنہ دیتی ہے، خود بدترین 'سیکولر فسطائیت' کی مرتکب ہورہی ہے۔ اس محدود اقلیت کو اپنے سارے اثرورسوخ اور وسائل ابلاغ پر قدرت کے باوجود یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے روکے۔ ان حضرات کو اپنی بات پر قائم رہنے اور اس کے اظہار کی آزادی کا حق ہے اور ہم اس کا دفاع کریں گے۔ تاہم دلیل اور شائستگی کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنی بات کہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر وہ اس دائرے سے باہر نکلتے ہیں تو خود پاکستان میں ان کی تحدید اور گرفت کے لیے قوانین موجود ہیں۔ لہٰذا انھیں اپنی رائے اور ترجیحات کو ملّت اسلامیہ پاکستان کی عظیم اکثریت پر مسلط کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ جمہوریت کو اصل خطرہ اس آمرانہ اور جارحانہ ذہنیت سے ہے اور اسے قابو میں رکھنا خود جمہوریت کے فروغ اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔

خود مسلم معاشرے میں جو کمزوریاں اور نظریاتی تنوع بہت سے تاریخی اسباب کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے اس کو برداشت کرنا ضروری ہے۔ افہام و تفہیم، تعلیم و تعلّم اور بحث و مباحثہ اور مکالمے کے ذریعے مختلف علیہ اور مختلف فیہ کا تعین ہوسکتا ہے۔ اتفاق کے وسیع دائرے میں تعاون ہو اور اختلاف کا احترام بھی اصول کے معاملات میں یکسوئی اور استقامت کی طرح ضروری سمجھا جائے۔ مسلم معاشرہ آزادی اور رواداری کی بنیاد پر وجود میں آتا اور ترقی کرتا ہے۔ کثرت میں وحدت اور حدود اللہ کے دائرے میں تنوع اس کی امتیازی شان ہے۔ اس کی مثال اس باغ کی سی ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوں۔

سارے اختلافات کے باوجود نرمی اور توسع ہمارا شعار رہا ہے اور آج بھی اسی میں بقا اور ترقی کا راز مضمر ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جن چیزوں پر عظیم اکثریت یکسو ہے، جن کو وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتی ہے اور جن پر اپنی اُخروی زندگی کی کامیابی

کا یقین رکھتی ہے، ان کے بارے میں محض کسی اختلافی نقطۂ نظر کے دباؤ میں عمل نہ کیا جائے۔ جس طرح نظریاتی اقلیت کے حقوق ہیں، اسی طرح نظریاتی اکثریت کے بھی حقوق ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

- یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان ہونے اور قرآن و سنت پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں، یہاں تک تو اس کو آزادی حاصل ہے، لیکن اسلام کو قبول کرنا ایک ذمہ داری ہے۔ ہر ذمہ داری کے کچھ بنیادی تقاضے ہوتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انسان کی یہ آزادی کچھ میدانوں میں محدود ہو جاتی ہے، اس لیے کہ اسلام نام ہی اس عہد کا ہے کہ انسان اللہ کو اپنا رب، خاتم الانبیاء رسول اکرم ﷺ کو اپنا رسول، ہادی، آقا اور رہبر اور اسلام کو اپنا دین اور طریق زندگی تسلیم کرلے اور اس پر راضی اور مطمئن ہو جائے۔ 'جزوی مسلمان' یا 'نیم مسلمان' کا کوئی تصور دائرۂ اسلام میں نہیں اور عقل بھی اسے گوارا نہیں کرتی۔ قرآن کریم نے صاف صاف فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ (البقرۃ ۲:۲۰۸)

اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو، دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے، اور شیطان کے طریقے پر عمل پیرا نہ ہو۔

اسلام کی کچھ تعلیمات اور احکام کو ماننا اور کچھ کا انکار کر دینا، اللہ کی اطاعت اور بندگی کا راستہ نہیں ہے۔ اسلام کے شعوری اقرار کے بعد بندہ اپنی آزادی کو اللہ کی حدود کا پابند کرلیتا ہے اور پھر صرف ان حدود کے دائرے میں اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ یہ تحدید وہ اپنی مرضی سے قبول کرتا ہے، لیکن اس تحدید کے بعد یہ حق اسے نہیں رہتا کہ جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے رد کر دے۔ یہ آزادی نہیں تناقض، دورنگی اور منافقت ہے جس کی اسلام ہی نہیں کسی بھی نظام میں گنجائش نہیں ہو سکتی

اور جس کے نتیجے میں بجز کش مکش اور صلاحیتوں اور وسائل کے ضیاع کے کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم کا فیصلہ ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف ۱۲:۴۰)

فرماں روائی کا اختیار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (الاعراف ۷:۳)

لوگو، جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المائدہ ۵:۴۴)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء ۴:۶۵)

نہیں (اے محمدؐ) تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔

یہ ہے سچے مسلمانوں کی روش۔ اسی کا تقاضا ہے کہ شریعت کو بالادستی حاصل ہو۔ ماننے والوں کے لیے صحیح راستہ یہی ہے اور نہ ماننے والوں کو حق نہیں کہ ماننے والوں کو اپنے ایمان اور عقیدے کے مطابق اپنی زندگی کی شاہراہ تعمیر کرنے سے روکیں۔

یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلام ایک اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ کا بھیجا ہوا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دکھایا ہوا راستہ ہے۔ یہ مکمل نظام حیات ہے اور اس میں زندگی کے تمام مسائل اور معاملات کا حل بھی موجود ہے اور انسانی معاشرے میں تغیر و تبدل اور ترقی وارتقا کی جو حقیقی ضروریات ہیں ان کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس فریم ورک میں اطاعت، آزادی، اختلاف اور تنوع ہر ایک کا اپنا مقام ہے لیکن یہ سب کچھ اس کے اپنے اصول اور ضابطوں کے مطابق ہے۔ جہاں اسلام زندگی کے بنیادی معاملات کے بارے میں واضح اور دوٹوک راہ نمائی دیتا ہے وہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے لیے بھی خود اپنے نظام میں کافی و شافی گنجائش اور مواقع رکھتا ہے۔ البتہ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا، جو اس کے نظام اقدار کی ضد اور نفی کرنے والی یا ان کو مجروح کرنے والی ہو۔ خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ (جو صحیح اور صحت مند ہے اسے قبول کر لو اور جو ناموافق ہے اسے ترک کر دو) کا اصول اس عمل کو ہمیشہ جاری وساری رکھتا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ۵:۳) کے اعلان کے بعد زمان و مکاں کے تمام تغیرات اور وسعتوں کے باوجود آج تک اسلام ایک ہی رہا ہے۔ نہ عربوں کا اسلام کوئی الگ ہے اور نہ پاکستان، ایران، ترکی، یورپ، امریکا اور افریقہ کے مسلمانوں کا۔ اسی طرح پہلی صدی کا اسلام، چوتھی صدی کا اسلام اور بیسویں صدی کا اسلام اپنا کوئی الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ اسلام تو ایک ہی رواں دواں دریا کے مانند ہے، جس میں پانی کے نئے دھارے ملتے بھی رہتے ہیں اور اس کی نوعیت اور سمت پھر بھی ایک جیسی ہی رہتی ہے خواہ ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، مالکؒ، غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ کا تصورِ اسلام ہو یا اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کا تصور۔ یہ سب اسی ایک اسلام کے علم بردار تھے اور قرآن و سنت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے باہر یا اس میں غیر اسلام کی آمیزش سے رُونما ہونے والے کسی نظر ثانی شدہ اسلام کے نہ قائل تھے اور نہ داعی۔ ان پر اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ ان کے اسلام اور مُلّا کے

نام نہاد اسلام کو دست و گریباں کیا جائے اور اقبال اور قائد اعظم کا نام لے کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت سے فرار کی راہیں تلاش کی جائیں۔

علامہ اقبال کی تو پوری زندگی کا مشن اور پیغام ہی یہ تھا:۔

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئینِ حق گیرد نظام از نظامِ محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علم و پیدا ستے ہم عصا و ہم یدِبیضا ستے
با تو گویم سّرِ اسلام است شرع شرع آغاز است و انجام است شرع
ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت قوم را رمزِ بقا از دست رفت

(رموزِ بے خودی)

سچا علم شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور سنتِ رسولؐ کی بنیاد محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ملّت کو بھی شریعت ہی سے نظام حاصل ہوتا ہے اور پختہ نظام اسے دوام عطا کرتا ہے۔ شریعت کے علم ہی سے (عمل پر) قدرت حاصل ہوتی ہے: یہ عصا (قوت کا نشان) اور یدِ بیضا (نورِ ہدایت) بھی حاصل ہوتا ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام کا راز ہے ہی 'شرع' کا آغاز اور 'شرع' ہی کا انجام۔
حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہی دینِ فطرت ہے، اور شرعِ محمدیؐ آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔

جب حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شعار (یعنی شریعت) ہاتھ سے نکل گیا تو قوم رمزِ بقا سے بھی محروم ہو گئی۔

رہے قائد اعظمؒ اور ان کے حقیقی رفقا (نواب زادہ لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل

خاں، بہادر یار جنگ، سردار عبدالرب نشتر، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ) تو تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد کم از کم ڈیڑھ دو سو ایسے واضح بیانات تو صرف قائداعظمؒ کے موجود ہیں، جن میں اسلام کو اس جدوجہد کی منزل اور قرآن، اسوۂ رسولؐ، اسلامی قوانین اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بالادستی کے قیام کو پاکستان کا مشن اور ہدف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کی دو ایک تقاریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کے تصورات کی غلط تصویر پیش کرنے کی مذموم سعی کی جاتی ہے۔ یہ روش ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی اور تمام حقائق کے سامنے آجانے کے باوجود ایک گروہ وہی رٹ لگائے جارہا ہے۔ اس سے خود اس گروہ کی بدنیتی بے نقاب ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کا مقصد قائداعظم کے پورے تصور کو پیش کرنا نہیں، بلکہ اپنے مقاصد کے لیے چند جملوں کو استعمال کرنا ہے۔ ایسی صریح بددیانتی پر اُٹھائی جانے والی دیوار ریت کی دیوار ہی ہوسکتی ہے جو کسی تعمیر میں کام نہیں آسکتی۔

کراچی میں ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا:

> وہ کون سی چٹان ہے جس پر ملّت کی عمارت قائم ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جو سفینۂ ملّی کو تھامے ہوئے ہے؟ مسلم انڈیا کے سفینۂ ملّی کا مستحکم لنگر عظیم المرتبت کتاب قرآنِ مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ہماری یہ وحدت بھی بڑھتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، ایک قبلہ اور ایک قوم!

سرحد [خیبر پختونخوا] مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو جو پیغام قائد نے ۱۹۴۵ء میں دیا، وہ یہ تھا:

> پاکستان کا مطلب صرف آزادی و حُریت کا حصول نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریئے کا

تحفظ بھی ہے جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ قیمتی تحفے اور بیش بہا خزانے ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔

اسی سال عید کے پیغام میں فرمایا:

یہ جزان لوگوں کے جو بے خبر ہیں، ہر شخص آگاہ ہے کہ قرآنِ مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر و بالاتر اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی بھی، معاشی و معاشرتی بھی، دیوانی بھی، فوج داری بھی، تجارتی بھی، عدالتی بھی اور تعزیری بھی یہ ضابطہ زندگی کی ایک ایک چیز کو باقاعدگی اور ترتیب عطا کرتا ہے۔

سبّی دربار کے موقعے پر ۱۲ فروری ۱۹۴۸ء کو قائد نے عہد کیا:

میرا ایمان ہے کہ ہم سب کی نجات ان سنہری قواعد اور زریں احکام کی پیروی میں مضمر ہے جو ہمارے رہن سہن اور معاملاتِ زندگی کو درست رکھنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیے ہیں۔ آیئے! ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر استوار کریں۔ خدائے قادر و مطلق نے ہمیں سکھایا ہے کہ مملکت کے تمام اُمور میں ہمارے فیصلے بحث و تمحیص اور مشاورت کی راہ نمائی میں ہوں۔

ہمیں بتایا جائے کہ قرآن و سنت کی واضح شاہراہ اور اسلام کے ضابطۂ قانون سے ہٹ کر اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا اسلام کون سا ہے؟ یہ ان دونوں بزرگوں پر تہمت اور خلط مبحث کی ایک شرم ناک کوشش ہے۔ شریعت میں کوئی ابہام نہیں اور ہر مسلمان اس شریعت کا علَم بردار اور طالب ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی امانت کی شکل میں دی ہے۔ شریعت جو ہماری آزادی، دنیوی فلاح اور اُخروی کامیابی کی ضامن ہے، جو تمام انبیاء کی سنت رہی ہے اور جسے اپنی آخری اور مکمل شکل میں محمد عربیؐ نے انسانیت تک پہنچایا اور آج جس کی امین اُمت مسلمہ ہے۔ کامیاب اب وہی ہوگا جو اس راستے پر گامزن ہو:

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰىهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ كَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

(اعراف ۷:۱۵۷)

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بند شیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اسلامی قانون کی بنیادیں

شریعت اور اس کے نفاذ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کی نوعیت اور حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جو فرق شریعت یا اسلامی قانون اور مغربی قانون میں ہے، اسے نظر میں رکھا جائے۔ لغت کے اعتبار سے 'شرع' اور 'شریعت' کے معنی راستے کے ہیں۔ پرانے زمانے میں گھریلو استعمال کے لیے پانی، محلے یا دیہات کے کنویں، تالاب، نہر یا چشمے وغیرہ سے لایا جاتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کے بار بار وہاں آنے جانے سے ایک ایسا راستہ بن جاتا تھا، جو سیدھا، مختصر، کشادہ، واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اسی راستے کو عربی لغت میں شریعت کہا جاتا تھا۔ گویا وہ سیدھا، کشادہ اور واضح راستہ جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ذخیرے اور مصدر و ماخذ تک پہنچا دے۔

اصطلاحی اعتبار سے 'شریعت' سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا اور جو دین کے احکام اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے اور انسانی زندگی کی ان اصولوں کے مطابق عملی تشکیل کرنے کا واحد راستہ ہے۔

قرآن و سنت اس شریعت کے اصل اور بنیادی مآخذ ہیں۔ اس کے ایک حصے کا تعلق عقائد، افکار اور احساسات سے ہے اور دوسرے کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے۔ فقہ یا اسلامی قانون شریعت کے اس حصے کا نام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اسلامی تشکیل سے بحث کرتا ہے۔ فقہائے کرام 'فقہ' کی یہی تعریف کرتے ہیں: ''فقہ وہ علم ہے، جس کے ذریعے شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے''۔

شریعت انسان کی عملی زندگی کے کم و بیش ہر پہلو کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس کے احکام جہاں ایک طرف امر و نہی، حلال و حرام، مستحب اور مکروہ کی نشان دہی کرتے ہیں، وہیں حدود کی اس صف بندی کے ساتھ ساتھ مباح اور انسانی آزادی کے میدان کو بھی واضح اور نمایاں کر دیتے ہیں۔ اور یہی وہ میدان ہے جس میں ہر دور میں اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعے نئی قانون سازی کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی رہے گی۔

شریعت کے صرف ایک حصے کا نفاذ ہر فرد اور ادارہ اپنی ذاتی مرضی اور پیش قدمی (Initiative) کی بنیاد پر کرتا ہے۔ کیونکہ دوسرا جزو ایک خودکار نظام (Self-executing system) کے ذریعے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رچا بسا ہوا ہے۔ عبادات و مناکحات میں معاملات کا ایک بڑا حصہ آجاتا ہے۔ لیکن شریعت کا ایک حصہ وہ ہے، جسے نافذ کرنے کے لیے معاشرے اور ریاست کی اجتماعی قوت درکار ہوتی ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس کے لیے آج کے دور میں دستور، قانون، ریاستی مشینری اور ضابطۂ کار اور عدالتی نظام کو شریعت کے مقاصد اور احکام کا خادم اور کارندہ بنانا ضروری ہے۔

اسلامی قانون بیک وقت ایک خالص مذہبی، نظریاتی اور روحانی قانون ہی نہیں بلکہ

ملکی اور عدالتی قانون بھی ہے۔ دوسری تہذیبوں اور مذاہب میں مذہبی قانون اور ملکی اور عدالتی قانون میں فرق کیا گیا ہے۔ مذہبی قانون بالعموم فرد کا ذاتی معاملہ سمجھا گیا ہے اور اس کے نفاذ کو بھی اس کے فہم و ارادے اور ضمیر پر چھوڑ دیا گیا۔ ریاستی اور عدالتی قانون صرف دنیاوی معاملات سے متعلق رہا اور اس کا انحصار رسم و رواج، بادشاہ کے حکم یا کسی بالاتر مقتدرہ یا مقننہ کے فیصلے اور عدالت کے فیصلے کی نظیر پر رہا۔ اسلامی قانون میں وحدت، ہم آہنگی اور ہمہ گیری ہے۔ یہ قانون محض عبادات اور اللہ اور بندے کے تعلق تک محدود نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کا تعلق انسانوں سے اور فرد کا معاشرے، اجتماع اور ریاست سے تعلق بھی اس کے دائرۂ کار میں شامل ہے۔ اسلام کا قانون شخصی، معاشی، دیوانی، تعزیری، بین الاقوامی تمام دائروں پر محیط ہے۔ یہ عبادات سے لے کر خاندانی زندگی، معاشی تگ و دو، عمرانی معاملات، جرم و سزا، جنگ و صلح، غرض ان سب کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

ایک مذہبی قانون ہونے کی حیثیت سے یہ ہر مسلمان کے ایمان کا معاملہ ہے اور اس پر عمل اس کے ایمان اور عقیدے کا تقاضا ہے۔ اس لیے قانون محض جبر اور قوتِ قاہرہ کی علامت نہیں، بلکہ ایمان کا تقاضا، دل کی پکار، زندگی کی آرزو اور اجتماعی زندگی کا ادب بن جاتا ہے۔ اس کا نفاذ صرف ڈنڈے اور پولیس کے ذریعے نہیں، بلکہ ضمیر کی آمادگی اور رب کی اطاعت گزاری کے جذبے سے عبارت ہے۔ بلاشبہ پولیس اور عدالت کا بھی ایک مقام ہے، لیکن جو چیز اسلام کے قانون کو منفرد درجہ دیتی ہے، وہ اندر کی آواز اور باہر کے قانون کی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کو تقویت دینے کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون پر پولیس کے پہرے اور مخبروں کے خوف سے کہیں زیادہ ضمیر کی خلش اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے عمل ہوا ہے۔ رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں میں بھی اس پر عمل درآمد کا جذبہ ویسا ہی قوی ہوتا ہے جیسا دن کی روشنی اور محتسب کی موجودگی میں۔ اور جرم کے ارتکاب کے بعد توبہ ہی نہیں بلکہ پاکی کے حصول کے لیے 'مجرم' خود سزا کا طالب بن جاتا ہے۔

جہاں اسلامی قانون کی یہ روح ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت اپنے نفاذ

کو محض ضمیر اور فرد کے ذاتی جذبے پر نہیں چھوڑتی، بلکہ انسانی فطرت اور معاشرے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ریاست کی شیرازہ بندی کے واضح احکام دیتی ہے، نظامِ امر قائم کرتی ہے، انتظامی مشینری وجود میں لاتی ہے، پولیس اور عدالت کے نظام کو قائم کرتی ہے، اور اس طرح اندرونی قوت اور جذبے کی تکمیل بیرونی قوت اور نظام کے ذریعے کرتی ہے۔ ریاست اپنے تمام اداروں کے ذریعے ایک طرف تلقین، تعلیم اور بہتر نمونے کا اہتمام کرتی ہے تو دوسری طرف ریاستی قوت اور عدالتی اداروں کے ذریعے قانون توڑنے والوں کی گرفت اور معاشرے کو جرم اور ظلم سے پاک کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ دین اور ریاست ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن جاتے ہیں۔ سیکولر ریاست اور اس کے تمام ادارے دین کی رہنمائی سے آزاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین ریاست اور معاشرے کے وسائل سے محروم رہتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے حضرت عثمانؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:

> اسلام ایک بنیاد ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور حکومت ایک نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر کسی عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ کمزور رہتی ہے اور گر جاتی ہے، اور اگر کسی عمارت کا کوئی محافظ اور نگہبان نہ ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس کو لوٹ لیا جاتا ہے یا اس پر دوسرے قابض ہو جاتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ:

- شریعت پوری زندگی کے لیے راہِ عمل ہے۔
- قرآن و سنت اور ان کی روشنی میں مستنبط کیے ہوئے احکام ہی مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔
- یہ شریعت زندگی کے تمام اُمور پر حاوی ہے۔
- دنیوی قوانین کی طرح یہ محض ریاست کی قوتِ قاہرہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ قانون، ایمان و ضمیر کی پکار کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مرتب

کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

- اندرونی پہل قدمی یا داعیہ کے ساتھ ساتھ ریاستی، انتظامی اور عدالتی نظام کا خود شریعت کے ماتحت ہونا اور اس کے نفاذ کے عمل میں شرکت اور معاونت کے لیے مثبت اور مؤثر کردار ادا کرنا، اس نظام کا حصہ ہے۔
- شریعت کے نفاذ کا عمل ایمان اور ضمیر کی بیداری، تعلیم و تلقین کے نظام، معاشرے کے آداب و روایات اور قانون کی قوت، ان سب کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ نہ محض اخلاقی تلقین اور نہ محض جبر و قوت کا استعمال۔

مندرجہ بالا عوامل کا ساتھ ساتھ مؤثر ہونا شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔

یہ عمل ہر فرد سے دل کی گہرائیوں سے اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے سرشار ہو کر شرکت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت، ریاست اور اس کے تمام اداروں کے لیے بھی لازم کرتا ہے کہ وہ تعلیم و تلقین اور اچھی مثال کے ساتھ ساتھ نیکی کا حکم اور برائیوں کے روکنے کا کام انجام دیں۔ حق دار کو اس کا حق پہنچانا اور ظالم کو ظلم سے روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز اور روزے کا اہتمام...... بلکہ نماز تو ہے ہی اس لیے کہ بُرائیوں سے روکے

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (العنکبوت ۲۹:۴۵)

اور روزے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ متقی بنیں اور قانون کی پاس داری کریں۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۱۸۳﴾ (البقرة ۲:۱۸۳)

تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔

ریاست کا مطلوبہ کردار

شریعت کے نفاذ کا کام بڑا منفرد اور بابرکت ہے۔ اس میں قانون اور اس کی حقیقی

اسپرٹ دونوں کا ساتھ ساتھ اہتمام ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل میں فرد، عوام، نظامِ تعلیم، ذرائع ابلاغ، اجتماعی اداروں اور حکومت سب کی شرکت ضروری ہے۔ البتہ دو وجوہ سے حکومت کا کردار سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے اور وہ یہ ہیں:

- اولاً، آج کی ریاست ایک ہمہ گیر ادارہ بن گئی ہے جو ملک اور معاشرے کے وسائل کے بڑے حصے پر تصرف کے اختیارات رکھتی ہے۔ اس لیے جب تک یہ وسائل شریعت کے تابع اور اس کے نفاذ کے لیے استعمال نہ ہوں تبدیلی نہیں آسکتی۔
- ثانیاً، مسلم معاشرہ صدیوں سے انتشار، اضمحلال اور غلامی کے بعد نئی زندگی کی تعمیر کے لیے سرگرداں ہے۔ صدیوں میں جو ادارے قائم ہوئے تھے اور جو اسلامی نظام کے لیے لنگر کا کام کر رہے تھے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ تعلیم کا ایک لادینی نظام دو صدیوں سے قوم پر مسلط ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کیفیت واقع ہو گئی ہے جسے علامہ محمد اقبالؒ نے یوں ادا کیا تھا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غیر اسلامی اور مغربی دنیا سے درآمد شدہ ادارے اور انتظامی دروبست مسلم معاشرے پر بزور ٹھونسے جا چکے ہیں۔ ان حالات میں تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فرد کی کوششوں کے ساتھ معاشرہ، ریاست اور اس کے تمام ادارے ظلم اور باطل سے نجات اور حق اور معروف کے قیام میں مکمل طور پر شریک نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف انفرادی کوششیں بار آور نہیں ہو رہیں۔ نجی طور پر خیر کے فروغ اور بدی کے مٹانے کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ بہت غنیمت ہے اور اس کے اچھے اثرات بچشم سر دیکھے جا سکتے ہیں، مگر مطلوبہ تبدیلی کے لیے وہ کافی نہیں۔ پاکستان کی گذشتہ تاریخ میں اس کش مکش اور اس کے بُرے نتائج کو دیکھا جا سکتا ہے۔ زندگی کو ان تضادات (Contradiction) اور تصادم سے پاک کیے بغیر ہم

اپنے انسانی اور مادی وسائل کو صحیح صحیح استعمال نہیں کر سکتے اور مطلوبہ نتائج رُونما نہیں ہو سکتے۔

آج مسئلہ صرف انفرادی خطااور بے راہ روی نہیں، اجتماعی فساد اور منظم ظلم ہے۔ اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ گویا زمین و آسمان بگاڑ اور فساد سے بھر گئے ہیں (ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الروم ۳۰:۴۱)۔ ان حالات میں اجتماعی قوتوں کی جانب سے تعلیم و تلقین، مظلوم کی دادرسی، اور حق دار کو حق پہنچانے سے معاشرے میں ظلم اور فساد دُور نہیں ہو جاتے، غربت اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوتا، مجبور اور مظلوم قوی نہیں بن جاتے جب تک منہ زور اور ظالم قابو میں نہیں کر دیے جاتے تب تک شریعت کے اہداف حاصل نہ ہو سکیں گے۔ اور یہی وہ میدان ہے جس کی اصلاح کے لیے ریاست اور اس کی اجتماعی قوتوں کو اسلام کے لیے مسخر کرنا ضروری ہے، تاکہ قرآن کے الفاظ میں انسانوں کے لیے انصاف اور عدل قائم ہو سکے۔ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ(الحدید ۵۷:۲۵)۔

نفاذِ شریعت کی منزل: خطوط کار اور رکاوٹیں

سوال یہ ہے کہ اس منزل کی طرف پیش قدمی کیوں نہیں ہو پاتی؟ کمی، کسر اور بگاڑ کہاں ہے؟ شریعت کے نفاذ کی راہ میں اصل رکاوٹیں کیا ہیں اور ان کا سدباب کیسے ممکن ہے؟

جیسا کہ ہم نے اُوپر نشان دہی کی، شریعت نے اپنے نفاذ کے لیے چار راستے اختیار کیے ہیں، یعنی:

۱۔ ایمان اور اندرونی محرک

۲۔ تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کا ایک ہمہ گیر نظامِ دعوت

۳۔ معاشرہ اور اس کے ادارے، خاندان سے لے کر وقف اور تکافل اجتماعی (رفاہ عامہ) تک

۴۔ ریاست، قانون اور نظامِ قضا (عدالتی نظام)۔

شریعت چاہتی ہے، یہ تمام کام انفرادی اور نجی سطح پر بھی انجام دیے جائیں اور اجتماعی طور پر بھی۔ چونکہ ریاست نظامِ امر کا مرکز ہے، اور اللہ کے رسولؐ نے جو وظائف بحیثیت سربراہ انجام دیئے، ان کی امین ہے۔ اس لیے ریاست اور حکومت کی ذمہ داری دوہری ہے، یعنی خود اپنے دائرے میں اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسرے تمام اداروں کی معاونت و سرپرستی، تاکہ فرد اور سول ادارے اپنے اپنے کردار بخوبی انجام دے سکیں۔

اجتماعی دائرے میں نفاذِ شریعت کے لیے جو حکمت عملی مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں اختیار کی ہے اس میں تنوع اور جدت ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت کے حالات اور مسائل کی روشنی میں انھوں نے کیا کیا راستے اختیار کیے۔ اصل نمونہ حضور اکرم ﷺ کا نمونہ ہے جو داعی، مربی اور معلّم بھی تھے اور سربراہِ مملکت، قاضی اور حاکم بھی۔ آپؐ کی قیادت میں ایک مرکزی نظام کے ذریعے مندرجہ بالا چاروں دائروں کی رہنمائی کا حق ادا کیا گیا اور تاریخ کا روشن اور کامیاب ترین انقلاب رُونما ہوا۔

خلافت راشدہ نے اسی نمونے پر عمل کیا اور نظامِ ریاست و قیادت میں شگاف پڑنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اُموی دور میں اس نمونے کے احیا کی کامیاب کوشش کی۔ بعد کے اَدوار میں یہ مرکزیت اور ہمہ گیری باقی نہ رہی لیکن ہر ہر میدان کے لیے مؤثر انتظام کی کوشش کی گئی اور وقت کے چیلنجوں کی روشنی میں خصوصیت سے ریاست، قانون اور نظامِ عدالت کو اسلام کے مطابق اور شریعت کی حدود میں رکھنے کے لیے نئے تجربات اور نئے انتظامات کیے گئے۔ اس سلسلے کا سب سے عظیم اور تاریخی کارنامہ اُمت کے معتبر اور معتمد علما کا غیر سرکاری انتظام کے تحت فقہ اور اصولِ فقہ کی تدوین ہے۔ یہ قانون اخلاقی اور اجتماعی عوامی قوت و تائید سے ملک کا قانون بنا اور ایک مؤثر اور آزاد نظامِ قضا (عدل) کا قیام عمل میں آیا جو شریعت کے نفاذ کا ضامن بن گیا اور خود اربابِ اقتدار بھی اس قانون کے اسی طرح تابع ہو گئے جس طرح باقی انسان۔

اس طرح قانون کا وہ تصور جو دوسری تہذیبوں اور مملکتوں میں 'حکمران کی مرضی'

کے مترادف تھا، بالکل بدل گیا۔ اسلامی قلمرو میں 'شریعت' ہی ملک کا قانون بن گئی اور حکمران کی مرضی بھی اس کے تابع ہوگئی۔ یہ قانون کسی قانون ساز اسمبلی نے نہیں بنایا تھا، اس کی تشکیل و ترقی میں سرکاری سرپرستی یا نظام سے وابستہ کسی ادارے نے نہیں بلکہ مسلمان اُمت اور اس کے آزاد فکری قائدین، علما، فقہا اور دوسرے اُمور زندگی کے ماہرین نے حصہ لیا۔ علمی، عوامی اور جمہوری طریقے اور عمل سے یہ قانون وجود میں آیا اور مسلسل ترقی کرتا رہا۔ اجتہاد، قیاس، استنباط، استحسان، مصالح مرسلہ، استدراک اور اجماع کے ذریعے تازہ فکر، مشاہدہ اور تجربہ اپنی اصل بنیاد سے تعلق قائم رکھتے ہوئے ترقی کرتا رہا اور ایک ہزار سال تک پوری اسلامی قلمرو کو سیراب کرتا رہا۔

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کچھ خداترس حکمرانوں نے اس قانون کو مرتب اور مدون کر کے اپنی قلمرو میں نافذ کرنے کی کوششیں کیں۔ اسلامی قانون کا یہ مزاج ہے کہ وہ محض حکمران کی مرضی یا ترجیحات یا مقننہ (قانون ساز ادارے) کی آزاد مرضی کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام، منشاو مرضی اور قرآن وسنت کے اصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کے بارے میں اصل ماخذ اور ان سے استفادے کے ضوابط کار کے مطابق رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کا نام 'اسلامی قانون' ہے۔

یہی وہ قانون ہے جسے دورِ غلامی سے نجات پانے اور آزاد مسلمان ریاست کے قیام کے بعد حاصل کردہ اختیار اور اقتدار کے اس زمانے میں ملّت اسلامیہ پاکستان نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ برطانوی اقتدار کے نقصانات اور مظالم کی فہرست تو بہت طویل ہے لیکن بیرونی استعمار کا سب سے پہلا ہدف شریعت اور نظامِ قضا (نظامِ عدل) ہی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے ہی ادارے تباہ کر دیے گئے اور آخری حصار یعنی خاندانی نظام پر بھی مختلف سمتوں سے تابڑتوڑ حملے کیے گئے اور اس عظیم الشان نظام کو تہ و بالا کر دیا گیا جو مسلمانوں نے اجتماعی میدان میں قائم کیا تھا۔

حصولِ آزادی کے بعد پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ریاست کا قبلہ درست کیا جائے، اس کے

مقاصد اور اہداف کو متعین کیا جائے اور نظامِ قانون کے مطابق اصول و ضوابط مرتب کیے جائیں۔ برطانوی دور میں تقریباً چار ہزار قوانین حکومت نے اپنے فرمان کے ذریعے مسلط کیے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ دستور کی صحیح بنیادوں پر تدوین کے بعد ان قوانین کا جائزہ لیا جاتا۔ ایمان اور آزادی کے تقاضوں کے مطابق پورے قانونی ورثے کا جائزہ لے کر نہ صرف ان تقاضوں سے متصادم قوانین یا قوانین کے حصوں کو ختم کیا جاتا، بلکہ نئی قانون سازی ہوتی، تاکہ مثبت انداز میں ان دونوں ضرورتوں کے مطابق نیا قانونی نظام اور عدالتی ڈھانچا وجود میں آتا اور اس طرح وجود میں آتا کہ کوئی بحرانی کیفیت نہ پیدا ہوتی۔ مگر اس سمت میں اول تو کوئی کوشش نہ کی گئی، اور اگر کوئی قدم اُٹھایا گیا تو وہ بھی نیم دلی کی تصویر بنا رہا۔

قراردادِ مقاصد اس سمت میں پہلا روشن اور تابناک قدم تھا۔ لیکن اس کے بعد سے آج تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی گردان کی جاتی رہی ہے اور اس سے وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں بار بار نفاذِ شریعت کے مطالبے اُٹھتے ہیں اور حکمران جان بچانے کے لیے چند نمائشی اقدام تو کرتے ہیں لیکن کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا بہت قریب سے تجربہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ہوا۔ ہم نے پورے خلوص سے ان کو اسلامی نظام کے نفاذ کا ایک مربوط اور مکمل پروگرام دیا، مگر اسلام کے لیے مخلصانہ جذبات کے اظہار کے باوجود وہ اس طرف کوئی حقیقی اور دیرپا پیش رفت نہ کر سکے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نفاذِ شریعت کے مسئلے کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ پھر مسئلے کی نوعیت کی مناسبت سے عملی اقدامات کا ایک ہمہ جہتی پروگرام مرتب کیا جائے اور اس کے نفاذ کے لیے مؤثر اور کارفرما مشینری وضع کی جائے۔

نفاذِ شریعت: بنیادی اقدامات

نفاذِ شریعت کسی ایک اعلان کا نام نہیں۔ یہ تو ایک مسلسل عمل (Process) ہے جس کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر جہت کو دوسری کا معاون و مددگار اور اس کی تقویت کا باعث

ہونا چاہیے، تب ہی مربوط اور دیرپا نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ جنرل ضیاء صاحب بار بار کہتے تھے کہ آپ مجھے کوئی ایک چیز بتادیں جس کے اعلان سے شریعت نافذ ہو جائے، اور میں ہمیشہ ان کو یہی سمجھاتا تھا کہ اگر آپ فی الحقیقت نفاذِ شریعت چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایک اعلان نہیں، تبدیلی کا ایک مفصل اور مربوط پروگرام بنانا ہوگا اس کے اہم اجزا یہ ہیں:

۱۔ دستور میں قرآن و سنت (شریعت) کی بالادستی کا اظہار اور اسے قانون سازی اور پالیسی سازی کے لیے مستقل ماخذ قرار دینا۔ نیز دستور میں ایسی ترامیم جو اس کو شریعت سے متصادم اجزا سے پاک کردے۔ دستور کو بار بار ادھیڑنا صحیح نہیں۔ اسی لیے دستور سازی اور قانون سازی میں فرق کیا جاتا ہے اور اس کا احترام ہونا چاہیے۔ خاص طور پر جب ہم نے تحریری دستور کا راستہ اختیار کیا ہے تو اس کے تقاضے بھی پورے کرنے چاہییں۔

۲۔ دستور میں شریعت کے قانونی احکام کے نفاذ کے لیے ایک واضح اور مؤثر نظامِ کار کا تعین دفعہ ۲۲۷ ایک اہم انتظام ہے [1] لیکن اس کا تقاضا ہے کہ پارلیمنٹ ایک متعین مدت میں اپنا فرض انجام دے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس کے لیے سات سال کی مدت رکھی گئی تھی کہ اس زمانے میں تمام مروجہ قوانین کو شریعت سے ہم آہنگ کرلیا جائے گا۔ یہ کام آج تک نہیں ہوا ہے۔

اسی دفعہ ۲۲۷ کی رُو سے آئندہ کے لیے بھی شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے قانون سازی ضروری ہے اور یہ قانون سازی اسمبلی اور سینیٹ کو 'اسلامی نظریاتی کونسل' کے مشورے اور معاونت سے کرنا تھی۔ مگر اس باب میں بھی ہمارا قومی ریکارڈ بڑا ہی افسوس ناک ہے۔

---

[1] دفعہ ۲۲۷: تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، جن کا اس حصے میں بطور اسلامی احکام حوالہ دیا گیا ہے، اور ایسا کوئی قانونی وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔

۳۔ دستور نے شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں دفعہ ۲۲۷ کے ساتھ ایک دوسرا راستہ 'پالیسی رہنما اصول' (باب ۲، دفعہ ۲۹تا ۴۰) کی شکل میں نکالا۔ جو عدالتوں کے ذریعے نافذ العمل نہیں تھا مگر ہر سال پارلیمنٹ کو کارکردگی کی رپورٹ کی شکل میں اس عمل کو آگے بڑھانا پیش نظر تھا۔اس سلسلے میں بھی پیش رفت صفر ہی رہی ہے۔

ان تینوں کے عملاً غیر مؤثر ہو جانے کے بعد نفاذِ شریعت کا ایک دوسرا نسبتاً مختصر راستہ عدلیہ کو یہ اختیار دینا تھا کہ خود اپنے ایما یا اختیار از خود نوٹس، یا کسی کے توجہ دلانے اور استغاثہ کرنے پر کسی قانون کا جائزہ لے کر متعین کر سکے کہ وہ قانون قرآن و سنت کے مطابق ہے یا متصادم، اور تصادم اور عدم تطابق کی صورت میں اسے کس طرح کالعدم کیا جائے۔

یہاں مسئلہ یہ پیش آیا کہ عدالتوں کے جج حضرات بالعموم اس بنیادی علم سے آراستہ نہیں جو اس کام کو انجام دینے کے لیے درکار ہے۔ صحیح راستہ تو یہ تھا کہ قانون کی تعلیم کے نظام کو اور وکلا اور ججوں کی تربیت، انتخاب اور ترقی کے اصول و ضوابط کو تبدیل کیا جائے۔ ایک ایسا انتظام کیا جائے کہ ایک معقول مدت میں نیچے سے اُوپر تک جج قانون کے علم کے ساتھ شریعت کا علم بھی رکھتے ہوں اور اخلاق و تقویٰ کے اعتبار سے بھی دینی معاملات میں قوم کے اعتماد کے مستحق ہو سکیں۔ یہ عمل صحیح اور معیاری ہونے کے باوجود وقت طلب تھا۔اس لیے صدر ضیاء الحق کے دور میں پہلے تمام ہائی کورٹوں میں شریعت بنچ کے قیام کی تجویز آئی، جسے عدلیہ نے پسند نہیں کیا۔ وفاقی شرعی عدالت کا راستہ اختیار کیا گیا، جس پر ۱۹۸۰ء سے عمل ہو رہا ہے اور جس کے لیے دستور میں ایک پورے باب کا اضافہ کیا گیا۔ اس میں چند بڑی بڑی خامیاں رہ گئیں:

۱۔ اس کا دائرۂ کار محدود تھا۔ قوانین کی اکثریت اس کے دائرۂ کار سے باہر تھی۔

۲۔ یہ صرف قانون یا اس کے کسی حصے پر کلام کر سکتی تھی۔ انتظامی احکام اس کے دائرے سے باہر تھے۔

۳۔ اس کے ججوں کا تقرر، تبدیلی، تنزلی وغیرہ کے بارے میں ایسے من مانے ضابطے بنائے گئے جو نہ صرف عدلیہ کی آزادی اور اس عدالت کے مستقل وجود کے منافی تھے، بلکہ خود اسلام کے تصورِ عدل کے ساتھ بھی مذاق تھے۔

۴۔ اسے دادرسی اور عارضی احکام (Interim injunctions) کا اختیار حاصل نہ تھا، یعنی یہ عدالت بالکل بے طاقت تھی۔

۵۔ اس کو صرف حدود کے معاملات میں اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ باقی اس کا اصل دائرۂ اختیار صرف قوانین کے بارے میں رائے دینے تک محدود تھا۔ غنیمت ہے کہ اتنی گنجائش تھی کہ اگر اس کے دیے ہوئے وقت میں مقننہ قانون سازی نہ کرے یا سپریم کورٹ میں اپیل نہ ہو جائے تو کم از کم زیر نظر قانون کا خلافِ شریعت حصہ کالعدم ہو جائے گا۔ گو اس کی نوبت کم ہی آسکی۔

اس طرح نفاذِ شریعت (قانون کے جدید تصور کی حد تک) کے جو راستے ہو سکتے ہیں، عملاً دونوں ہی غیر مؤثر رہے۔ اور اس وقت سب سے اہم فیصلہ یہی کرنا ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے، یا دونوں طریقوں کو بہ یک وقت جاری رکھا جائے۔

دیگر اہم عوامل

نفاذِ شریعت کا عمل محض قانونی عمل نہیں ہے، گو قانونی دائرے میں قانونی مشینری کے ذریعے اس کام کو انجام دینا ازبس ضروری بھی ہے اور اس کے لیے مزید مؤثر اقدامات بھی درکار ہیں۔ اس قانونی عمل کے ساتھ جن دوسرے اقدامات کی ضرورت ہے ہم ان کی نشان دہی کرتے ہیں:

○ **پالیسی سازی اور تقاضے:** اہم ترین چیز قانون کے ساتھ ساتھ پالیسی، پالیسی سازی کے طریق کار، پالیسیوں پر احتساب اور انتظامی احکامات کو بھی عدالتی نظرثانی (Judicial review) کے لیے کھولنا ہے۔ شریعت کے نفاذ کے لیے صرف قانون سازی ہی کافی نہیں،

بہت بڑا دائرہ پالیسی سازی کا ہے اور اس طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مشینری بھی موجود نہیں ہے۔ ہر وزارت آزاد ہے اور شرعی رہنمائی اور احتساب کا کوئی نظام نہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل محض ایک غیر مؤثر مشاورتی ادارہ ہے اور اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تعلق حکومتی مشینری سے نہیں۔ یہ ایک دُور دراز جزیرے کے طور پر کام کرتا ہے، جب کہ ملک کے پلاننگ کمیشن اور تمام مشاورتی اداروں سے اس کا دستوری، انتظامی اور عملی تعلق (Interaction) ہونا چاہیے۔ راقم کو اس کا عملی تجربہ اس وقت ہوا جب پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور وزیر منصوبہ بندی کی حیثیت سے نفاذِ اسلام کی طرف پیش قدمی اور منصوبہ سازی کی کوشش کی گئی۔ معلوم ہوا کہ نظریاتی کونسل کا کوئی ربط کسی پالیسی ساز ادارے سے نہیں اور نہ پالیسی ساز اداروں نے یہ زحمت کی کہ اس ادارے سے کوئی استفادہ کریں۔ ہم نے پلاننگ کمیشن اور نظریاتی کونسل کے مشترک اجتماعات کیے اور ان کی مشترک کمیٹیاں تشکیل دیں، تو معلوم ہوا کہ پالیسی سازی میں اسلام سے راہ نمائی لینے کا عمل کس طرح متحرک کیا جاسکتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی لیکن مختصر تجربہ تھا۔

'پاکستان قومی اتحاد' ۱۹۷۸ء کے وسط سے ۱۹۷۹ء کے اوائل تک چند ماہ کے لیے ضیاء حکومت کا حصہ رہا۔ مگر قومی اتحاد کے حکومت سے نکلنے کے بعد (۱۹۷۹ء) سارا انتظام بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں: ایک یہ کہ جب تک تمام پالیسی ساز اداروں اور افراد کو عملاً اس کام میں شریک نہ کیا جائے کوئی پیش رفت مشکل ہے۔ دوسرے، یہ کام محض وقتی طور پر نہیں، مستقل بلکہ اداراتی انتظام کی شکل میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے سب سے اہم چیز سیاسی اثرورسوخ، عزم وارادہ اور جذبۂ عمل (Political will) ہے۔ پاکستان کی گذشتہ تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نفاذ اسلام کے عمل کو غیر مؤثر اور غیر نتیجہ خیز کرنے والی چیز اسی سیاسی ارادے کی کمی ہے اور یہ صرف ایک فرد کے عزم کا مسئلہ نہیں، یہ پوری سیاسی مشینری اور اجتماعی قیادت کے ارادے اور عزم کا مسئلہ ہے۔ اور جب تک یہ حل نہ ہوگا، گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔

○ **تبدیلی قیادت:** دوسری اہم ترین ضرورت سیاسی عزم وارادہ ہے، جس کا اظہار ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انقلاب قیادت واقع ہو۔ اب تک کی تمام ہی قیادتوں کا حال (چند انفرادی استثنائی حوالوں کو چھوڑ کر) بڑا ہی مایوس کن رہا ہے۔ قانون سازی اور پالیسی کی تبدیلی کا آخری انحصار افراد کار کی تبدیلی اور انقلاب قیادت پر ہوگا۔ سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے کی قیادت میں اندر سے تبدیلی آئے یا اسے ایسے افراد سے تبدیل کیا جائے جو اس میدان میں قیادت اور نمونہ فراہم کر سکیں۔ اس قیادت کے لیے تین چیزیں ازبس ضروری ہیں:

اول: اس کا اپنا عزم، وژن، کردار اور نمونہ۔

دوم: اس کا علم، تجربہ، صلاحیت کار، مشاورتی نظام اور اعلیٰ کارکردگی۔

سوم: ایک مؤثر نظام شوریٰ اور احتساب تاکہ قیادت صحیح راستے پر قائم اور گامزن رہ سکے۔

اس سلسلے میں اہم ترین مثال سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی ہے کہ کس طرح ایک ایسے نظام میں جس میں بگاڑ واقع ہو گیا تھا اور قدیم جاہلیت نے اسلام کی انقلابی اصلاحات کو غیر مؤثر یا معدوم کر کے پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دیا تھا، انھوں نے ڈھائی سال کے مختصر وقت میں دوبارہ نظام حکومت و ریاست کو خلافت راشدہ کی راہ پر ڈالا۔ اور بے نفسی، قربانی، مفاد پرست طبقات پر ضرب اور ریاست کو اس کے اسلامی مقاصد کے لیے دوبارہ منظم کرنے کا کام انجام دیا۔ اپنی ذات سے اصلاح کا آغاز کر کے اپنے خاندان اور قبیلے کو لگام دی۔ حق پرستی، اصولوں پر عدم لچک، مظلوموں کی دادرسی، میرٹ کا اہتمام اور نتائج سے بے پروا ہو کر باطل سے سمجھوتوں کی روش سے اجتناب کیا۔ یہ تھا قیادت کا وہ نمونہ جو عمر ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا اور یہی وہ نمونہ ہے جس کی آج ضرورت ہے۔

○ **نظام تعلیم و تربیت:** دستور، قانون، پالیسی اور قیادت کے بعد تعلیم و تربیت، مطلوبہ

مردانِ کار کی تیاری اور ترغیب و ترہیب کے ایسے نظام کا قیام ضروری ہے جس کے نتیجے میں افراد ہر سطح پر ذمہ داری کے مقام پر آسکیں۔ لوگوں کو اعتماد حاصل ہو اور وہ نظام پر بھروسا کرنے لگیں۔ جہاں ضروری ہے کہ پہلے قدم پر ہی اس کام کا آغاز کر دیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہوگا اسے مستقل مزاجی سے جاری رکھنے کا اہتمام ہو تاکہ فطری انداز میں مناسب نظام الاوقات کے تحت تبدیلی واقع ہو سکے۔

○ **رائے عامہ کی ہمواری:** اس پورے عمل میں جہاں قانون کی بڑی اہمیت ہے، وہاں افراد اور معاشرے کی ایسی تیاری ضروری ہے کہ لوگ دلی آمادگی اور خوش دلی سے شریعت کے نفاذ کے عمل میں شریک ہوں۔ یہ کام محض وعظ سے ہو سکتا ہے اور نہ صرف جبر اور ڈنڈے کی قوت سے۔ حضور اکرم ﷺ نے جو طریقہ نفاذِ شریعت کا ہمیں سکھایا ہے اور جس کا نمونہ آپؐ نے پیش فرمایا ہے۔ اس کا نمایاں خاصہ دل اور زبان کی تبدیلی اور اخلاق و کردار کے انقلاب کے ساتھ قانون اور حکومت کی انتظامی اور تادیبی قوتوں کا متوازن اور حسین امتزاج ہے۔ نفاذِ شریعت کے لیے ہر دور میں ان دونوں دھاروں کا آپس میں ملنا اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانا ضروری ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے اور اس میں سب کی شرکت ضروری ہے۔ یہ مقصد پابندیاں لگانے اور ڈر اور خوف کی فضا پیدا کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے آزادی، اختلاف اور رواداری کا ہونا ضروری ہے، ورنہ آمریت اور استبداد کی فضا میں یہ عمل جاری نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے تو حقوق کا احترام، فرائض کی ادائیگی کا جذبہ، شوریٰ کی فضاء، نیکیوں میں مسابقت کا شوق، ایک دوسرے کے لیے احترام، ایثار، قربانی اور باہم معاونت درکار ہے تاکہ گرتوں کو تھاما جاسکے اور بے راہ روی کا شکار ہو جانے والوں کو سینے سے لگا کر جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچایا جاسکے۔ معاشرے میں یہ فضا اور یہ جذبہ پیدا کرنا بھی نفاذِ شریعت کا لازمی حصہ ہے۔

○ **مقاصدِ شریعت کا تحفظ:** یہ پورا کام جس ذہن اور جذبے سے ہونا چاہیے وہ وہی ہے جس کا نمونہ حضور اکرم ﷺ نے پیش فرمایا، یعنی دنیا میں انسانوں کے درمیان انصاف اور حقوق العباد کی ادائیگی، اور اصل منزل، آخرت کی کامیابی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

خوشنودی کا حصول، شریعت کے احکام وضوابط کو مقاصد شریعت کو نظرانداز کر کے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ مقاصد بہت واضح ہیں یعنی:

- دین وایمان کا تحفظ
- جسم وجان کی حفاظت
- اخلاق، عصمت، خاندان اور نسل انسانی کا تحفظ
- عقل وشعور کی حفاظت
- مال کا تحفظ۔

ان ہی کے قیام سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔

یہ بڑی معنی خیز حقیقت ہے کہ اسلام کے تعزیری قانون میں جن حدوں کے تحفظ کو قرآن وسنت نے سزاؤں کے تعین کے ساتھ طے کر دیا وہ یہی پانچ مقاصد ہیں۔ دنیا کے دوسرے تعزیری قوانین میں سینکڑوں نہیں ہزاروں جرائم اور ان کی سزائیں ہیں، لیکن اسلام نے جن جرائم اور ان کی سزاؤں کو حدود کا مقام دیا وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ دین وایمان کی حفاظت کے لیے ارتداد کی سزا کی حد، جسم وجان کے تحفظ کے لیے قصاص ودیت کا قانون، اخلاق، خاندان، عزت وعصمت اور نسل کے تحفظ کے لیے زنا اور قذف کی حدود، عقل کے تحفظ کے لیے تحریمِ خمر اور شراب کی حد اور مال کے تحفظ کے لیے سرقہ اور حرابہ کی حدود۔ یہ حدود سزائیں نہیں، یہ تو شریعت کے اصل مقاصد اور انسانی معاشرے کی اصل بنیادوں کے تحفظ کا نظام ہیں۔ مقصد سزا دینا نہیں، مقصد ان بنیادوں کا تحفظ، ان کی مضبوطی اور انسانی زندگی کو عدل وانصاف اور عزت وخوش حالی کی برکتوں سے مالا مال کرنا ہے۔

نفاذِ شریعت کے یہ ہیں وہ تمام پہلو، جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور مل کر ایک نامیاتی کل (Organic whole) بناتے ہیں۔ نفاذِ شریعت کے عمل کو ان سب کا احاطہ کرنا چاہیے، ورنہ وہ نامکمل اور غیر مؤثر رہے گا۔ اس مقصد کے لیے تمام اہل وطن کو اپنی ذمہ داری

ادا کرنی ہوگی۔ (دسمبر ۲۰۱۵ء)

نظریاتی اساس: پارلیمنٹ اور عدلیہ کا کردار

۲۰۱۵ء کا سال اس لحاظ سے اہم تھا کہ مسلم لیگ (ن) کی فیصلہ کن اکثریت کی بناء پر وزیر اعظم پاکستان کی کرسی پر میاں محمد نواز شریف ایک بار پھر متمکن ہوئے۔ اس مرتبہ انہوں نے مملکت کے نظریہ کے حوالے سے لبرل سوچ کا اظہار کیا۔ اس دوران عدالت عظمیٰ میں پاکستان میں دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے سرسری سماعت کی فوجی عدالتوں کے قیام کی ۲۱ویں آئینی ترمیم زیر بحث آئی۔ اس کے ساتھ ہی عدالت نے ۱۸ویں اور ۱۹ویں آئینی ترمیم پر فیصلوں کے بعد اٹھنے والے مسائل پر بھی غور کیا۔ اس تسلسل میں ۱۷ ججوں پر مشتمل فل کورٹ نے جو فیصلہ دیا اس فیصلے میں بعض بڑے بنیادی سوالات زیر بحث آئے۔ مثلاً:

- آئین کی حفاظت کے نقطہ نظر سے کون بالادست ہے؟ پارلیمنٹ یا عدالت عظمیٰ؟
- دستور کے بنیادی خدوخال میں کیا کیا موضوع شامل ہیں؟ اور کیا قرارداد مقاصد اور اسلامی دفعات دستور کے بنیادی خدوخال کا حصہ ہیں؟ کیا پارلیمنٹ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی ترمیم کر سکتی ہے؟ قرارداد مقاصد کیوں اہم ہے اور ہماری قومی زندگی کے لیے کیا راستہ متعین کرتی ہے؟
- پاکستانی سیاست و عدالت میں لبرل و سیکولر سوچ کا اظہار اور عدلیہ کے زیر بحث فیصلے میں کیا ربط ہے؟
- بنیادی حقوق کو دستور میں کیا مقام حاصل ہے؟ پروفیسر خورشید احمد نے عدالتی مباحث کی روشنی میں لکھے گئے اس مضمون میں ان سوالات کا تجزیہ کر کے ملت پاکستان کا تاریخی و نظریاتی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

پاکستان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محض ایک خطۂ زمین

کا نام نہیں۔ پاکستان ایک نظریہ پہلے ہے اور ایک مملکت بعد میں۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے پاکستان نام کا کوئی خطۂ زمین دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھا لیکن ایک نظریہ تھا، جو ایک قوم کو اپنے نظریاتی اور تہذیبی وجود کے تحفظ اور ترقی کے لیے ایک خطۂ زمین پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی ایک تاریخی جدوجہد میں سرگرم کیے ہوئے تھا۔ یہی وہ جدوجہد تھی جس کے نتیجے میں اللہ کے فضل سے، قائداعظمؒ کی قیادت میں اُمت مسلمہ پاک و ہند کی بے پناہ قربانیوں کے نتیجے میں پاکستان کے تصور نے ایک خطۂ زمین کی شکل اختیار کی۔ عالمی سیاسی بساط پر ایک ایسے ملک کا رُوپ دھارا جو صرف ایک قومی ریاست (نیشن اسٹیٹ) نہیں، بلکہ اپنی اصل میں ایک نظریاتی ریاست ہے۔ یہ مغرب کی لادینی لبرل جمہوریت اور ایشیا کی اشتراکی ریاست اور بھارت کی سیکولر ریاست کے مقابلے میں ایک ایسے سیاسی تصور کے مظہر کے طور پر وجود میں آئی جس میں دنیوی مسائل کو حل کرتے ہوئے الہامی ہدایت اور اخلاقی قوت کی تسخیر کے ذریعے سب کے لیے عدل و انصاف، اخوت اور بھائی چارے اور حقوق و فرائض کی پاس داری پر مبنی نظام قائم کیا جاسکے۔

پاکستان میں نظریاتی کشمکش

پاکستان کے تمام مسائل اور مصائب کی اصل جڑ ہی یہ ہے کہ قائداعظم اور قائدِ ملت کے بعد ملک کی زمامِ کار پر ایسے لوگوں نے قبضہ کر لیا، جن کا کوئی عملی کردار تحریکِ پاکستان میں نہ تھا۔ ملک غلام محمد، محمد علی بوگرا، جسٹس منیر، اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان ایک دوسری ہی فکر کے علم بردار، اور ایک دوسرے ہی طرزِ زندگی کے گرویدہ تھے۔ انھوں نے نظریاتی نیشن اسٹیٹ کو محض ایک 'نیشن اسٹیٹ' (قومی ریاست) میں ڈھالنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں نظریاتی، معاشی اور تہذیبی کش مکش رُونما ہوئی۔ اس کش مکش نے قوم کو بانٹ دیا ہے اور وہ اصل منزل کی طرف یکسوئی اور یک جہتی سے گامزن ہونے کے بجائے مفادات کی جنگ کی آماج گاہ بن گئی ہے۔ قائداعظمؒ نے نہایت صاف الفاظ میں حصولِ آزادی کے بعد قوم کو یہی یاددہانی کرائی تھی کہ:

ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلامی اصولوں کو آزما سکیں۔
(۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء، اسلامیہ کالج پشاور)

۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومت پاکستان کے افسروں سے کراچی میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

جس پاکستان کے قیام کے لیے ہم نے گذشتہ ۱۰ برس جدوجہد کی ہے، آج اللہ کے فضل سے وہ ایک مسلّمہ حقیقت بن چکا ہے، مگر کسی قومی ریاست کو معرضِ وجود میں لانا مقصود بالذات نہیں ہو سکتا بلکہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں، جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے پھولے، اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔

پاکستان کی طاقت کا سرچشمہ یہی وژن اور اس کو حقیقت کا رُوپ دینے کی انفرادی اور اجتماعی کوشش ہے، اور پاکستان کی کمزوری اور خلفشار کا سبب اس نصب العین اور منزل سے صرفِ نظر کر کے چھوٹے چھوٹے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے سرگرم ہونے میں ہے۔

دستوری ترامیم اور عدالتی فیصلہ

اس مرکزی اہمیت کے مسئلے پر ہماری اور پوری قوم کی توجہ ایک بار پھر سپریم کورٹ کے فل کورٹ (۱۷ ججوں) کے فیصلے نے مرکوز کرا دی ہے۔ اگرچہ فیصلے کا اصل موضوع دستور کی ۱۸ویں، ۱۹ویں اور ۲۱ویں ترامیم[1] ہیں اور ان کے بارے میں اکثریتی رائے سے وہ تلوار ہٹ گئی ہے جو ان ترامیم پر منڈلا رہی تھی۔ پارلیمنٹ کو بھی سکھ کا سانس لینے کا موقع مل

[1] 18ویں ترمیم: ۱۰ اپریل ۲۰۱۰ء * 19ویں ترمیم: یکم جنوری ۲۰۱۱ء * 21ویں ترمیم: 7 جنوری ۲۰۱۵ کو منظور ہوئی۔

گیا ہے کہ ان ترامیم کو رد نہیں کیا گیا۔ عدالت بھی خوش ہے کہ اس نے اپنے اختیارات سے دست برداری اختیار نہیں کی، اور دفاعی ادارے بھی سُکھ کا سانس لے رہے ہیں کہ فوجی عدالتوں میں سویلین ملزموں پر مقدمات چلانے کا راستہ ہموار ہو گیا ہے۔ کوئی اسے عدالتی تدبر (Judicious statesmanship) قرار دے رہا ہے، کسی نے اسے 'عدالتی حقیقت پسندی' (Judicial pragmatism) کا نام دے دیا ہے اور کوئی اس پر 'عدالتی موقع پرستی' (Judicial opportunism) کی پھبتی کی تہمت دینے سے بھی گریز نہیں کر رہا۔ بظاہر فیصلہ چند قانونی اور انتظامی اُمور سے متعلق ہے، لیکن ۹۰۲ صفحات پر مشتمل اس فیصلے میں بڑی اہم قانونی اور نظریاتی بحثیں کی گئی ہیں۔ بڑی عرق ریزی سے جج حضرات نے اپنے فیصلے لکھے ہیں۔ آٹھ ججوں کا مرکزی اور اجتماعی فیصلہ ہے اور اِس وقت کے چیف جسٹس سمیت نو ججوں نے الگ اپنے اپنے فیصلے لکھے ہیں اور پاکستان کے نظریاتی تشخص، قرارداد مقاصد کے مقام اور کردار، دستور میں کسی ناقابل تغیر اساس کے وجود یا عدم وجود، عدالتوں کے کردار اور پارلیمنٹ کے دستور میں ترمیم کے اختیار جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ فیصلہ متفقہ نہیں لیکن اختلافی فیصلے (Split judgement) کی وجہ سے بحث بڑی مفید، متنوع اور ہمہ جہتی ہو گئی ہے اور نقطہ ہائے نظر کے اختلاف اور امکانات کے تنوع نے سوچ بچار کے نئے گوشے وَا کر دیے ہیں۔ یہ بات بھی باعثِ مسرت ہے کہ بحث کا معیار بالعموم بڑا علمی اور باوقار ہے اور ان مباحث میں غور و فکر اور اختلاف و اتفاق کا بڑا سامان موجود ہے اور منظر یہ نظر آتا ہے کہ ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مباحث میں کچھ بڑے سخت مقامات بھی آ گئے ہیں، جن پر نقد و احتساب، علمی بحث اور کھلے ذہن سے افہام و تفہیم کی کوشش کی ضرورت ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے قومیں ترقی کر سکتی ہیں۔

بحث طلب بنیادی اُمور

دستور میں ۱۸ویں ترمیم اپریل ۲۰۱۰ء میں ہوئی تھی اور اس کے خلاف درخواستیں اس وقت سے عدالت کے زیرِ سماعت تھیں۔ دستور کی دفعہ ۱۷۵۔اے کے بارے میں، جس کا موضوع اعلیٰ عدلیہ میں ججوں کا تقرر تھا، عدالت کے ایک جزوی فیصلے کی روشنی میں پارلیمنٹ نے ۱۹ویں ترمیم کی اور اسی طرح ۱۸ویں اور ۱۹ویں دونوں ترامیم عدالت کے زیرِ غور آ گئیں۔ فوجی عدالتوں کے قیام کو دستوری چھتری فراہم کرنے کے لیے 'ضربِ عضب' کی ضرورتوں کو پورا کرنے، تینوں افواج سے متعلق خصوصی قوانین میں اور خود دستور میں ۲۱ویں ترمیم کے ذریعے تبدیلیاں کی گئیں، تاکہ ایسی فوجی عدالتیں قائم ہوسکیں جن میں سول ملزموں پر مقدمہ چلایا جاسکے۔ ان ترامیم کو عدالت میں چیلنج کیا گیا اور تقریباً ۳۹ درخواستیں (Petitions) سپریم کورٹ میں داخل کی گئیں، جن کے بارے میں فل کورٹ کا فیصلہ ۵۔ اگست ۲۰۱۵ء کو سنایا گیا ہے۔

تفصیلات سے قطع نظر اگر مرکزی مباحث کا تجزیہ کیا جائے تو بنیادی مسائل تین ہی تھے: یعنی اعلیٰ عدالتوں میں ججوں کے تقرر کا نظام اور اس میں پارلیمنٹ کا کردار، ایسی فوجی عدالتوں کا قیام کہ جن میں کچھ خاص نوعیت کے الزام میں سویلین شہریوں پر مقدمہ چلایا جائے، اور غیر مسلموں کے لیے پارلیمنٹ میں مخصوص نشستوں پر تقرر کا طریقہ۔ پہلے اور تیسرے مسئلے کا تعلق ۱۸ویں اور ۱۹ویں ترمیم سے ہے اور دوسرے کا تعلق ۲۱ویں ترمیم سے ہے، لیکن بات صرف ان متعین مسائل کی نہیں تھی۔ عدالت کو زیادہ موضوعات پر بڑی گہرائی میں جاکر رائے قائم کرنا پڑی اور اصل اہمیت ان بنیادی مسائل ہی نے اختیار کرلی، یعنی:

۱۔ کیا پاکستان کے دستور کا کوئی بنیادی ڈھانچا یا متعین اور ناقابلِ تغیر حصے ہیں جو دستور کی اساس ہیں اور جن کو تبدیل کرنے کا اختیار خود پارلیمنٹ کو بھی حاصل نہیں؟ بہ الفاظِ دیگر دستورِ مملکت، بلاشبہ ملک کے سیاسی اور قانونی نظام کی بنیاد ہے، لیکن زمانے کی

تبدیلیوں اور نئے مسائل اور مشکلات کے پیدا ہونے سے اس میں ترمیم و تبدیلی بھی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دستور اگر ایک قوم اور ملک کے اجتماعی نظام کا صورت گر ہے، اور اسے قوم نے ایک بنیادی فیصلے کے طور پر طے کیا ہے، تو اس میں کن چیزوں کو تبدیل کیا جاسکتا ہے؟ کون سی ایسی بنیادیں ہیں، جو قوم کی شناخت کے ان پہلوؤں کی حامل ہیں، جن کی تبدیلی سے اس کا وجود اور اجتماعی تشخص بھی مجروح ہوجاتا ہے؟ یقیناً کچھ ایسے ناقابلِ تغیر حصے، اصول یا اقدار ہیں جنھیں پارلیمنٹ ترمیم کے نام پر تبدیل نہیں کرسکتی۔ ترمیم صرف جزوی معاملات کے بارے میں ہوسکتی ہے۔ اصل مقاصد کے حصول کی راہ میں اگر کچھ رکاوٹیں آرہی ہوں تو ان کو رفع کرنے کے لیے ہوسکتی ہے، لیکن قوم کے مقاصد اور نظریاتی اہداف، بنیادی حقوق اور اساسی اداروں، یعنی مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور ان کا توازن، یا ایسی ہی کچھ دوسری چیزیں ہیں، جو وجود کا درجہ رکھتی ہیں وہ ناقابلِ تغیر ہیں۔ نیز ان ناقابلِ تغیر حصوں یا اصولوں کا تعین کون کرے گا؟ کیا دستور خود یہ طے کرے گا یا دستور کی روشنی میں عدلیہ کا بھی اس میں کوئی کردار ہے؟

۲۔ اگر دستور کا کوئی بنیادی ڈھانچا یا ناقابلِ تغیر اصول، اقدار اور اہداف ہیں تو پھر ان کی حفاظت کیسے ہو؟ کیا پارلیمنٹ ہی ان کی واحد ذمہ دار ہے، یا دستور کے ان پہلوؤں کی حفاظت کی ذمہ داری میں عدلیہ کا بھی کردار ہے جسے قانون کی اصطلاح میں عدلیہ کے نظرثانی کرنے کا اختیار (Judicial review) کہتے ہیں؟

۳۔ بنیادی حقوق کو دستور میں کیا مقام حاصل ہے؟ دستور نے ہی پارلیمنٹ پر یہ پابندی لگا دی ہے کہ وہ بنیادی حقوق کے خلاف قانون سازی نہیں کرسکتی اور دستور نے اعلیٰ عدلیہ کو یہ اختیار دیا ہے کہ متاثر افراد کی شکایت پر یا ازخود نوٹس لیتے ہوئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کا نہ صرف نوٹس لے، بلکہ اگر کوئی قانون ان سے متصادم ہو

تواس کو خلافِ دستور قرار دے کر منسوخ کر دے۔ لیکن کیا یہ اختیار اس صورت میں بھی حاصل ہے جب پارلیمنٹ عام قانون سازی نہیں، بلکہ کوئی ایسی دستوری ترمیم کرے جو بنیادی حقوق کو پامال کرنے یا مجروح کرنے کا سبب بن سکتی ہو؟

انسانی حقوق کی حفاظت اور عام افراد کے لیے عدل کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب عدلیہ آزاد ہو۔ کیا پارلیمنٹ ایسی قانون سازی یا دستوری ترمیم کر سکتی ہے، جو عدلیہ کی آزادی کو مجروح کر دے اور اس طرح وہ دستور کی حفاظت اور بنیادی حقوق کی ضمانت کا فرض ادا نہ کر سکے؟ نیز اگر ریاست کا کوئی نظریہ ہے، جیسے پاکستان کے دستور میں 'قراردادِ مقاصد' اور دستور کی دفعہ ۲ اور ۲۔اے میں اسلام کو ملک کا مذہب قرار دیا گیا ہے اور قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی پر پابندی ہے، کیا ان حصوں میں بھی ترمیم ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا دفعہ ۲۔اے کے نتیجے میں قانون ہی نہیں دستور کے بارے میں بھی عدالت یہ فیصلہ دے سکتی ہے کہ اس کی کچھ شقیں قرآن و سنت سے متصادم ہیں؟ یہ سوال بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے کہ کیا ایسی ناقابلِ تغیر چیزوں کا تعین ہو گیا ہے یا خود اس بارے میں غور و فکر کا دروازہ کھلا رہے گا اور اس فہرست میں اضافہ یا کمی ہو سکتی ہے اور اگر ہو سکتی ہے تو یہ فیصلہ کون کرے گا۔ یعنی کیا پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ ہی وہ ادارہ ہے، جو اس کو متعین کرنے کا کام انجام دے گی، یا اس میں پارلیمنٹ کا بھی کوئی کردار ہے، یا صرف پارلیمنٹ ہی یہ فریضہ انجام دے سکتی ہے؟

اس بحث میں ایک بنیادی اور مشکل سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ کیا ترمیم کے معنی معمولی اور جزوی تبدیلیاں ہیں، جو اصل مقاصد کے حصول کے لیے ضرورت کے تحت یا مشکلات کو دُور کرنے کے لیے یا نئے امکانات سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کی جاسکتی ہیں؟ یا ترمیم کے معنی دستور کو Re-write کرنا، یا زیادہ خام لفظوں میں اس کی مکمل تنسیخ (Abrogation)، یا ایسی تبدیلیاں کرنا ہے جو اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیں،

یعنی Subversion؟ اور اگر ترمیم اور تنسیخ دو الگ الگ چیزیں ہیں تو یہ فیصلہ کون کرے گا کہ جو ترامیم کی گئی ہیں ان میں کہاں معاملہ صرف ترمیم کا ہے اور کہاں بات تخریبی (Subversive) حد تک پہنچ گئی ہے اور کہاں بات تنسیخ یا معطل کرنے (Suspension) کی صورت اختیار کر گئی ہے؟

۴۔ ایک اور اہم مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق 'نظریۂ ضرورت' سے ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جسٹس محمد منیر کے زمانے سے آج تک یہ آسیب بار بار سایۂ فگن رہا ہے۔ ملک غلام محمد کے پہلی دستوریہ کو تحلیل کرنے سے لے کر جنرل پرویز مشرف کے دستور کو معطل کرنے تک، دستور پر بار بار یہ شب خون مارا گیا ہے، اور ہر بار اعلیٰ عدالتوں نے 'نظریۂ ضرورت' کا سہارا لے کر ایسے اقدام کو جواز اور اعتبار (Validation) فراہم کیا ہے اور پارلیمنٹ نے بھی بعد میں بہ امر مجبوری انھیں تحفظ دیا ہے، لیکن عدالتِ عظمیٰ ہی نے کم از کم دو بار دو ٹوک الفاظ میں 'نظریۂ ضرورت' کی نفی کی ہے۔ دستور کو منسوخ کرنے یا محض معطل کرنے کو اختیارات کا بدترین استعمال کہا ہے اور اسے کسی بھی قسم کا قانونی تحفظ فراہم کیے جانے کو بھی وطن دشمنی یا غداری (High treason) قرار دیا ہے، اور اس کے مرتکب کو غاصب (Usurper) کہا ہے۔ عاصمہ جیلانی کیس میں چیف جسٹس حمود الرحمٰن کی صدارت میں عدالت نے جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء (۱۹۶۹ء۔۱۹۷۱ء) کو ایسا ہی جرم قرار دیا تھا (سپریم کورٹ میں کرمنل اپیل نمبر ۱۹، ۱۹۷۲ء عاصمہ جیلانی بمقابلہ گورنمنٹ آف پاکستان)۔ اسی طرح ایک مقدمے میں چیف جسٹس افتخار چودھری کی سربراہی میں فل کورٹ نے 'نظریۂ ضرورت' کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا اعلان کیا تھا (بیرسٹر اعتزاز احسن کی انٹرا کورٹ اپیل پر سپریم کورٹ کا فیصلہ ۵ مارچ ۲۰۱۲ء)۔ خود پارلیمنٹ نے ۱۸ویں ترمیم کے ذریعے دفعہ ۶ میں مزید ترمیم کر کے 'نظریۂ ضرورت' سے برأت کا اعلان کیا تھا، لیکن کیا فی الحقیقت 'نظریۂ ضرورت' کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا ہے؟ یا

بظاہر اس کا دروازہ بند کیا گیا ہے، مگر کھڑکی یا روشن دان کھلے ہیں، جن سے اس کے داخل ہو جانے یادر آنے کے امکانات موجود ہیں؟ یہ وہ بڑے ہی بنیادی مسائل ہیں جن پر اس موجودہ فیصلے میں معرکتہ الآرا بحثیں کی گئی ہیں، گو کوئی متفقہ فیصلہ نہیں آسکا۔ تاہم اکثریتی اور اقلیتی فیصلوں کی شکل میں بحث کے تمام ہی اہم گوشے منقش ہو کر سامنے آگئے ہیں اور اس طرح اختلاف رائے کے آئینے میں امکانات کی شکلیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

فیصلے کے اہم نکات

اگر ہم فیصلے کا خلاصہ پیش کریں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ :

(الف) اکثریت نے دبے لفظوں میں یہ تسلیم کرلیا ہے کہ دستور کے کچھ حصے اور کچھ اصول اور اقدار جن پر دستور مبنی ہے وہ ناقابل تغیر ہیں۔ بھارت میں جس انداز میں بنیادی ڈھانچے کے نظریئے کو دستوری اصولِ قانون (Constitutional jurisprudence) کا حصہ بنادیا گیا ہے وہ کیفیت تو ہماری عدالت کے فیصلے میں نظر نہیں آتی، مگر اصول کی حد تک الفاظ بدل کر دستور کے بنیادی خدوخال (Salient features) کی بات کو اکثریت نے تسلیم کیا ہے۔

(ب) اُوپر جس اصول کو تسلیم کیا گیا ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس باب میں پارلیمنٹ کے اختیارات بسلسلہ ترمیم دستور کی تحدید ہو جاتی ہے، اور اس حد تک اعلیٰ عدلیہ کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دستوری ترامیم پر بھی نظرثانی کرسکے، جس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر وہ کسی ترمیم کو دستور کے بنیادی خدوخال سے متصادم پائے تو اسے کالعدم قرار دے سکتی ہے۔

(ج) دستور کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟ اس بارے میں کچھ نکات کو فیصلے کے مختلف حصوں میں بیان کیا گیا ہے، لیکن کوئی جامع فہرست اور مکمل تصویر نہیں دی گئی۔

بنیادی حقوق کا تحفظ اور عدلیہ کی آزادی اور حقوق اور دستور کی حفاظت کے باب میں اس کے کردار کو واضح طور پر دستور کے بنیادی خدوخال کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اسلام کو ملک کا مذہب تسلیم کرنے اور اس کے وجود کی اصل وجہ (Raison d'etre) تسلیم کرنے کے باوجود کھل کر اسے دستور کے بنیادی خدوخال میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ بلاشبہ اس کا انکار نہیں کیا گیا ہے اور چند محترم جج صاحبان نے اپنے انفرادی فیصلے میں 'قرارداد مقاصد' اور دستور کی اسلامی دفعات کو بنیادی خدوخال کا حصہ قرار دیا ہے، خصوصیت سے جسٹس جواد ایس خواجہ، جسٹس سرمد جلال عثمانی، جسٹس اعجاز افضل خان، جسٹس دوست محمد خان، جسٹس شیخ عظمت سعید اور جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحبان نے بلاواسطہ یا بالواسطہ انداز میں قراردادِ مقاصد اور دفعہ ۲۔اے کو ایک مرکزی اہمیت دی ہے۔ آٹھ ججوں کے مشترک فیصلے میں اس کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے، حالانکہ عدالت کے دستوری ترمیم پر نظرثانی کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ جناب جسٹس ثاقب نثار نہ عدالت کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں اور نہ قرارداد مقاصد کو کوئی مستقل اور فیصلہ کن کردار دینے کا عندیہ دیتے ہیں، بلکہ ان کے فیصلے میں 'قراردادِ مقاصد' کا قد کاٹھ کم کرنے (Belittle) کے متعدد پہلو پائے جاتے ہیں، جن پر ہم آگے کلام کریں گے۔

چیف جسٹس ناصرالملک صاحب نے بھی چونکہ پارلیمنٹ کو اس بارے میں مکمل اختیارات کا حامل قرار دیا ہے، اور اس ضمن میں عدلیہ کے کسی کردار کی نفی کی ہے، اس لیے وہ بھی 'قراردادِ مقاصد' کی فیصلہ کن حیثیت پر خاموش ہیں۔ اس طرح اکثریت نے بلالحاظ اس کے کہ وہ دستوری ترمیم کے باب میں عدالت کے نظرثانی کے حق کے قائل ہیں یا نہیں، کھل کر دستور کے بنیادی خدوخال میں 'قراردادِ مقاصد' اور 'اسلامی دفعات' کا ذکر نہیں کیا۔ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) وجیہہ الدین احمد نے یہ ذکر نہ ہونے کو ایک بھول قرار دیا ہے۔ خدا کرے یہ صرف

بھول ہو، لیکن اگر یہ بھول ہے تب بھی کوئی معمولی بھول نہیں ہے، جلد از جلد اس کی تلافی ہونی چاہیے اور ایسا ہونا ہی خوشی کی بات ہو گی!

(د) فوجی عدالتوں کے باب میں ۱۷ میں سے چھ جج صاحبان نے انھیں دستور کے خلاف قرار دیا ہے لیکن ۱۱ جج صاحبان نے دستور اور اس کی بنیادی حقوق کی دفعات سے انھیں متصادم تصور نہیں کیا۔ البتہ عدالت کے لیے جزوی نظر ثانی کی کھڑکی ضرور کھول دی ہے، جو روشنی کی ایک ہلکی سی کرن ہے۔ نیز اس ترمیم کا ایک متعین مدت (دو سال) کے لیے ہونا بھی ایک مثبت پہلو ہے جسے عدالت نے اپنی رائے قائم کرتے وقت ملحوظ رکھا ہے۔

(ہ) غیر مسلموں کی اضافی نشستوں کے بارے میں عدالت نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ لیکن چونکہ اکثریت نے آٹھویں ترمیم کو دستور سے متصادم قرار نہیں دیا، اس لیے اس سلسلے میں درخواست خود بخود غیر مؤثر ہو گئی ہے۔

ہم قانون کی حکمرانی کے قائل ہیں اور عدالت کا فیصلہ ہی اس وقت کا قانون ہے اور اس وقت تک رہے گا، جب تک پارلیمنٹ یا عدلیہ اس میں تبدیلی نہ کریں، لیکن دنیا بھر میں یہ بڑی صحت مند روایت ہے کہ عدالتی فیصلوں کے ان پہلوؤں پر بحث و گفتگو کی جاتی ہے، جن کا تعلق اصولوں سے ہو، یا وہ ان اُمور سے متعلق ہوں جو عوامی اہمیت کے حامل ہیں، جیسے انسانی حقوق، معاشی حقوق، معاشرتی عدل اور معاشرے کے اخلاقی اور تہذیبی مسائل وغیرہ۔ اس فیصلے کے اختلافی فیصلہ ہونے کے معنی یہ بھی ہیں کہ خود اعلیٰ عدالت میں مختلف آرا، بلکہ متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج کا اکثریتی فیصلہ کل کا اقلیتی فیصلہ بھی بن سکتا ہے اور آج کا اقلیتی فیصلہ کل کا اکثریتی فیصلہ۔ اسی طرح صرف علمی بحثوں میں ہی نہیں، عدالتی بحثوں میں بھی اکثریتی فیصلے کے ساتھ اختلافی فیصلوں کو بھی دلیل کی بنیاد بنایا جاتا ہے اور ایسے فیصلوں کا حوالہ (Quote) بھی دیا جاتا ہے۔ یہی وہ صحت مند روایت ہے جس کے ذریعے غور و فکر کا باب کھلا رہتا ہے اور علمی ترقی اور انصاف کی فراہمی دونوں میں مدد ملتی

ہے۔اسی جذبے کے ساتھ ہم فاضل عدالت کے ججوں کے لیے احترام کے بہترین جذبات کے ساتھ کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں:

نظریۂ ضرورت کے احیاء کا خدشہ

پہلی گزارش 'نظریۂ ضرورت' کے دوبارہ بڑی خاموشی سے سر اُٹھانے کے بارے میں ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ فیصلے میں 'نظریۂ ضرورت' کا کھل کر دفاع نہیں کیا گیا ہے، اور ایک ڈھکے چھپے انداز میں حالات کی سنگینی اور غیر معمولی کیفیات کی بناپر، وقتی طور پر ایک محدود مدت کے لیے، کچھ نظرثانی کی گنجائش پیدا کرتے ہوئے، سویلین افراد کے لیے فوجی عدالتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔اس کے لیے کچھ گنجائش اس بنیاد پر نکالی گئی ہے کہ دستور میں عدالتی نظام میں کثرتیت (Plurality) پہلے ہی موجود ہے۔ اگر 'خصوصی عدالتیں' اور 'ٹریبونل' موجود ہیں، تو اسی چلن کے تحت وقتی طور پر تھوڑی سی گنجائش اور بھی پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن یہاں اس بنیادی بات کو شاید ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ دستور نے مرکزی نظامِ عدل سے ہٹ کر جہاں کہیں گنجائش پیدا کی ہے، وہ بھی بنیادی طور پر سول قانون ہی کی فراہمی کی ایک شکل ہے۔ جہاں تک قانون کے عمومی طریقہ عمل (Due process of law) کا تعلق ہے، جو اَب دستور میں ایک بنیادی حق کے طور پر موجود ہے، اور جو اسلام کا بھی ایک مسلّمہ اصول ہے، اس باب میں نظام عدل میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں قانون کا بنیادی ڈھانچا اور قانونی عمل ایک ہی ہے، گو خصوصی میدانوں کے لیے علیحدہ انتظام کیا گیا ہے۔ فوجی عدالتوں کا معاملہ اصولاً مختلف ہے۔ بلاشبہ اس کے اپنے آداب اور قواعد ہیں، لیکن شہری قانون (Civil law) میں جسے 'قانونی عمومی طریقہ عمل' کہا جاتا ہے اس میں گرفتاری کی وجہ بتانا، دفاع کا حق، اپنی مرضی کے وکیل کا انتظام، دورانِ حراست ضروری تحفظات، مقدمے کی کھلی سماعت وکارروائی، شہادتوں پر جرح کا حق، فیصلے کے خلاف اپیل کے امکانات وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے برعکس فوجی عدالتی نظام میں یہ چیزیں نہیں ہو سکتیں۔

اصل ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے عدالتی نظام کو ٹھیک کریں۔ تفتیش (Investigation) اور استغاثے (Prosecution) کو صحیح بنیادوں پر منظم کریں۔ ججوں، وکیلوں اور گواہوں کو تحفظ فراہم کریں۔ عدالتوں کی تعداد میں اضافے اور مقدمے کے لیے فیصلے کی مدت میں کمی انصاف کی فراہمی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح دہشت گردی کی خصوصی عدالتوں کو بہتر بنا کر وہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے جو فوجی عدالتوں میں دہشت گردی کے ملزمان کو بھیجنے سے حاصل کیا جانا پیشِ نظر ہے۔ پھر قانون میں یہ بڑا سقم ہے کہ دہشت گردی کو بھی انواع واقسام میں تقسیم کر دیا گیا ہے، گویا مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر کی جانے والی دہشت گردی اور شے ہے، اور نسلی، لسانی، معاشی، سیاسی اور دوسری بنیادوں پر کی جانے والی دہشت گردی اور شے۔ یہ صریح امتیاز (Discrimination) ہے جو انسانی شرف اور ہمارے دستور دونوں کے خلاف ہے۔

'نظریۂ ضرورت' نے اس قوم کو بڑے چرکے لگائے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں اور ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے کہ یہ نظریہ کسی چور دروازے سے آکر ایک بار پھر ملک میں قانون کی حکمرانی اور عدل کی فراہمی کے نظام کو تہ و بالا نہ کر دے۔

نظریاتی تشخص اور اسلامی دفعات

دوسرا اور اہم ترین پہلو جس پر ہم بات کرنا چاہتے ہیں، اس کا تعلق دستور کی اسلامی دفعات اور ملک کے نظریاتی تشخص کی حفاظت اور ترقی سے ہے۔ ہماری نگاہ میں ملک و قوم کے مستقبل کا انحصار اس مسئلے کے بارے میں صحیح موقف اختیار کرنے پر ہے۔ ریاست اور مذہب کے تعلق اور پاکستان کے نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی میں اسلام کے کردار کے بارے میں ملک کے اندر اور باہر ایک مخصوص طرزِ فکر کو منظم انداز سے پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک خاص گروہ ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت فکری انتشار پھیلانے اور اسلام اور دینی قوتوں کو نشانہ بنانے میں مصروف ہے۔ اس پسِ منظر میں عدالت عظمیٰ کے حالیہ فیصلے کی اہمیت بڑھ جاتی

ہے اور یہ ضرورت اور بھی محکم ہو جاتی ہے کہ اس بارے میں قوم میں مکمل یکسوئی ہو۔ دلیل، تاریخی حقائق اور قوم کے حقیقی جذبات و احساسات کی روشنی میں قوم، پارلیمنٹ اور عدالت ایک واضح راستہ اختیار کریں۔ ہمیں توقع ہے کہ ان شاءاللہ سپریم کورٹ آف پاکستان اس فیصلے پر نظرثانی کر کے وقت کی اس ضرورت کو پورا کرے گی۔ ہم مسئلے کی اہمیت اور نوعیت کی صحیح تفہیم کے لیے اصل مسئلے اور عدالت کے فیصلے میں اُٹھائے گئے سوالات کے بارے میں اپنی معروضات پیش کرتے ہیں۔ ہم دلیل سے بات سننے اور خود اپنی رائے پر دوبارہ غور کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ ہوں گے۔ ہماری درخواست اور دُعا ہے کہ ہماری اعلیٰ ترین عدالت کے فاضل جج بھی دلیل سے بات سننے اور اگر دلیل معقول ہو تو اپنی رائے پر نظرثانی کرنے کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا پاس کریں گے۔

پاکستان کا قیام محض تحریکِ آزادی کا ایک حصہ نہیں، بلکہ ایک قوم کے حق خودارادی کی بات، ایک نظریئے کی بنیاد پر ایک علاقے کے حوالے سے تھی، یعنی قوم ایک نظریئے کے تحفظ اور ترقی کے لیے ایک علاقے کو حاصل کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نظریہ ہی قوم کی بنیاد تھا اور نظریہ ہی ریاست کی بنیاد بنا۔ قراردادِ مقاصد اس نظریاتی اور تاریخی حقیقت کا دستاویزی مرقع اور پاکستانی قوم کے ریاست سے عمرانی معاہدے کا اقرار و اظہار ہے۔ یہ روایتی طور پر دساتیر اور قوانین میں درج ہونے والے عام پیش لفظوں (Preambles) سے قطعاً مختلف اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفرد دستاویز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف دستور ہی نہیں، پاکستانی قوم اور ریاست کی زندگی میں اس کا ایک ایسا مقام ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی اور جسے کوئی درہم برہم نہیں کر سکتا۔

'قراردادِ مقاصد' کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تین اور دستاویزات، خطبہ الٰہ آباد، قرارداد لاہور اور ۱۹۴۶ء کی قرارداد کو بغور دیکھا جائے اور ان کے پس منظر میں قراردادِ مقاصد کے اصل پیغام اور مقام کو متعین کیا جائے:

- **خطبۂ الٰہ آباد:** پہلی دستاویز علامہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا خطبہ ہے، جس میں کھل کر تین

باتوں کا اعلان کیا گیا ہے اور وہ تینوں ہی آگے کی جدوجہد، تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے سنگ ہائے میل بنیں۔

اوّلاً: اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ دین و دنیا کی تفریق کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالرسولؐ صرف ایک عقیدہ نہیں بلکہ وہ بیک وقت بندے اور رب کے درمیان جہاں ایک روحانی اور اخلاقی تعلق کو استوار کرتے ہیں، وہیں انسانوں کے درمیان تعلقات اور سماجی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے لیے بھی ایک واضح ضابطۂ کار فراہم کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں عقیدے اور اجتماعی زندگی میں ایک ناقابلِ تنسیخ تعلق قائم ہوتا ہے۔ یہ تعلق اتنا بنیادی ہے کہ ایک کی کمزوری یا رشتے کی نوعیت کی تبدیلی واقع ہو، تو دوسرا رشتہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ عقیدے کے طور پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کو اسلام کے احکام کے مطابق ڈھالنے کا اہتمام ہو اور جو چیزیں اس میں مانع ہیں، ان سے نجات حاصل کی جائے۔

دوم: برعظیم پاک و ہند میں مسلمان مغرب کے لبرل جمہوری نظام کا حصہ بن کر اپنا دینی اور اجتماعی تشخص برقرار نہیں رکھ سکتے۔ مسئلہ صرف مسلمانوں کے دنیوی مفادات اور سیاسی حقوق کا ہی نہیں، ان کے دین و معاشرت اور ان کے عقیدے اور ایمان کا بھی ہے۔ جن حالات سے مسلمان دوچار ہیں، ان میں ہندو اکثریت کے ساتھ مشترک قومیت اور مشترک سیاسی اور اجتماعی نظام کی صورت میں نہ ہماری تہذیب و تمدن کی بقا ممکن ہے اور نہ سیاست اور معاشرت کی اور نہ عقیدے اور ایمان کی حفاظت۔ اس لیے نئی سیاسی تنظیم بندی اور سیاسی اقتدار کے لیے نئی علاقائی تشکیل ناگزیر ہو گئی ہے۔

سوم: اُوپر کے مقاصد کے حصول کے لیے جو قابلِ عمل راستہ ہے، وہ تقسیمِ ملک ہے، تاکہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں ان کو نئی سیاسی تنظیم کے ذریعے آزاد اور خود مختار ملک کی شکل دے دی جائے، اور جن علاقوں میں ہندوؤں کی

اکثریت ہے وہاں وہ حکمران ہوں۔

- **قراردادِ لاہور:** اس سلسلے کی دوسری دستاویز مارچ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور اور اس کی تشریح میں کی جانے والی قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تقریر ہے، جس میں مسلمانوں کے ایک عقیدے، ایک دین، ایک تصورِ حیات، ایک ضابطۂ اخلاق اور ایک تہذیب و تمدن کے حامل ہونے کی بنیاد پر ایک قوم کا تصور دیا گیا اور اس قوم کے لیے اپنے نظریات کے مطابق زندگی کے نقشے کو تشکیل دینے کے لیے ایک آزاد ملک کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں پاکستان کا نام نہ تھا، تاہم نئی ریاستی تشکیل کے بارے میں ایک ابتدائی خاکہ دیا گیا تھا۔

- **قرارداد ۱۹۴۶ء:** تیسری اہم دستاویز اپریل ۱۹۴۶ء کی وہ قرارداد ہے، جس میں ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی واضح ترین اور معتبر ترین تشریح و تعبیر کی گئی۔ جس میں دوقومی نظریئے کو قرارداد کے دیباچے کے طور پر قرارداد کا حصہ بنایا گیا اور پھر جس کے تقاضے کے طور پر ایک مملکت جس کا نام پاکستان ہوگا، اس کا واضح تصور پیش کیا گیا۔ اس قرارداد پر پورے برعظیم سے منتخب ہونے والے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان نے اللہ کا نام لے کر اور اس اقرار کے ساتھ کہ: ''میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے''

  قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ (الانعام ۶: ۱۶۲)

  حلف لیا تھا کہ اس مقصد سے وفادار رہیں گے اور اس کے لیے کسی قربانی سے کوئی دریغ نہیں کریں گے۔

یہ ہیں وہ تین دستاویزات، جن کے خمیر سے قراردادِ مقاصد کی صورت گری کی گئی ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب کسی اور طرف جوڑنا تاریخ اور حقائق دونوں سے زیادتی ہوگا۔

قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے کم از کم ۱۳ بار پاکستان کے اسلامی تشخص اور

تاریخی کردار کا کھل کر اظہار کیا، اور تقسیم سے قبل ۱۰۰ سے زیادہ بار جو تصور انھوں نے دیا تھا اور جس نے برعظیم کے مسلمانوں کو ایک نیا عزم، نئی زندگی اور نئی جدوجہد پر کمربستہ کیا تھا اس کا اعادہ کیا۔ جو افراد اس مشن اور منزل سے انحراف یا اغماض کی باتیں کر رہے تھے ان کو منہ توڑ جواب دیا۔

قراردادِ مقاصد کی جوہری حیثیت

اس پس منظر میں پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ سے باہر اس امر پر کھلا اظہارِ خیال ہوا کہ دستور کو کیسا ہونا ہے، اس کو ایک قراردادِ مقاصد کی شکل میں دستور کے بننے سے پہلے مرتب کر دیا جائے، تاکہ پاکستان کی منزل کا تحریکِ پاکستان کے اوّلیں ذمہ داران کے ہاتھوں دستوری زبان میں تعین کر دیا جائے۔ اس زمانے کے اخبارات میں دیکھا جاسکتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے سینکڑوں قائدین اور کارکنوں اور علمائے کرام کی بڑی تعداد نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ریاست کے اسلامی کردار کے بارے میں دستوری زبان میں جلد از جلد اظہار و اعلان کیا جائے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، مولانا اکرم خان کے مشورے سے جناب لیاقت علی خان اور ان کے رفقا خصوصیت سے جناب عبدالرب نشتر اور جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ایک مسودہ تیار کیا، جس پر پارلیمنٹ سے باہر اہلِ علم سے بھی مشاورت ہوئی۔ میں گواہ ہوں کہ اس کا مسودہ پارلیمنٹ میں آنے سے پہلے مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم کے ذریعے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کو ملتان جیل میں دکھایا گیا اور انھوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

قراردادِ مقاصد محض ایک دستوری دیباچہ (Preamble) نہیں بلکہ ایک مستقل دستوری دستاویز ہے اور 'میگنا کارٹا' کی طرح اپنا منفرد وجود رکھتی ہے۔ بلاشبہ اس میں پاکستان کی نظریاتی اساس کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور پاکستان میں کن بنیادوں پر اور کن خطوط پر اجتماعی نظام کا قیام عمل میں آئے گا، اس کے تمام ضروری خدوخال واضح کر دیے گئے ہیں۔

ساتھ ہی ان بنیادی خدوخال کی روشنی میں دستور بنانے کی ہدایت (Direction) دی گئی ہے، جو محض ایک خواہش یا نظری تمنا نہیں، بلکہ واضح طور پر ایک قانونی حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ قراردادِ مقاصد کی زبان، اس کی ترتیب، اس کے مندرجات ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے تمام دساتیر میں پائے جانے والے دیباچوں سے اس کا موازنہ کرلیجیے، یہ سب سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پاکستان میں بنائے جانے والے تمام دساتیر میں بطور دیباچہ یہ شامل ہے، وہاں اس کی اپنی ایک مستقل بالذات حیثیت ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اور پھر ۱۹۸۵ء میں ترمیم کے ذریعے بطور دفعہ ۲۔اے شامل ہوجانے سے، اس کے قانونی کردار میں اگر کوئی ابہام تھا بھی، تو وہ دُور ہوچکا ہے۔

قراردادِ مقاصد پہلی دستور یہ میں بڑی اچھی فضا میں کھلی بحث کے بعد منظور کی گئی۔ تمام مسلمان ارکانِ پارلیمنٹ نے اس کی تائید کی اور چند نے بڑی جان دار تقاریر کیں، جو ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ صرف کانگریس کے ارکانِ اسمبلی نے مخالفت کی، اور اس طرح ایک بار پھر وہی منظر دنیا نے دیکھ لیا، جو تقسیم سے قبل تحریکِ پاکستان کے دوران شب و روز نظر آتا تھا مسلمان اپنے ایمان، نظریئے اور نظامِ زندگی پر مبنی شناخت کی بنیاد پر ایک فریق اور ہندو اور سیکولر قوتیں دوسرا فریق۔ مسلمانوں میں علما بھی تھے اور لبرل بھی، لیکن سب یک زبان تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے لے کر میاں افتخار الدین صاحب تک سب نے اس قرارداد کے حق میں پورے جذبے اور جوش سے بڑے محکم دلائل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا اور کانگریس کے ہندو ارکان نے اپنے تاریخی اور روایتی موقف کے مطابق اختلاف کا اظہار کیا۔ کانگریس کے ارکان نے درجن بھر ترامیم بھی پیش کیں، جو اکثریت سے رد کردی گئیں۔ پھر قرارداد منظور ہوئی، لیکن اس پر کوئی ووٹنگ نہیں ہوئی۔ اس لیے اسے دستور ساز اسمبلی کی متفقہ قرارداد بھی کہا جاسکتا ہے، لیکن اس سے زیادہ اہمیت یہ ہے کہ پوری قوم نے یک زبان ہوکر اس کی تائید کی۔ اس پر اللہ تعالٰی کا شکر ادا کیا، اس کے ذریعے ملک کی منزل اور ترقی کا رُخ متعین کردیا اور اس کی شکل میں اللہ کی حاکمیت کا ابدی اور سب سے بڑی حقیقت کی حیثیت سے اظہار

کیا۔ واضح رہے کہ حالیہ سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ملک کی قیادت نے اللہ کی حاکمیت اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ حدود کے اندر اپنی آزادی اور اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تشکیل کا عہد کیا اور پارلیمنٹ کو حکم دیا کہ ان خطوط پر نیا دستور مرتب کرے۔ یہ محض ایک خواہش کا اظہار نہ تھا، جیسا کہ جسٹس جواد ایس خواجہ نے بھی اپنے وضاحتی نوٹ میں لکھا ہے۔ قراردادِ مقاصد کی امتیازی شان ہی یہ ہے کہ وہ ایک واضح رہنمائی (Direction) ہے اور اس حیثیت سے وہ خود بھی ایک حکم (Order) کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں جو اصول طے کیے گئے ہیں، وہ بھی اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں، جو ایک تاریخی عمرانی معاہدہ ہیں اور جن میں کسی کو بھی تغیر و تبدیلی کی اجازت نہیں۔ وہ اصول کیا ہیں؟ پہلے ان کو ذہنوں میں تازہ کرلیں تاکہ قراردادِ مقاصد کی امتیازی شان اور اس کا دیا ہوا پاکستان کا وژن واضح ہو جائے:

- قراردادِ مقاصد کا سب سے اہم حصہ اس کا ابتدائیہ ہے، جو پوری قرارداد کے رُخ اور خطوطِ کار کو متعین کرتا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ پوری قوم، ریاست اور اس کے تمام اداروں کے لیے واضح اور مستقل ہدایات کی بنیاد فراہم کرتا ہے:

"چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیارِ حکمرانی ایک مقدس امانت ہے"۔

اس تمہید پر جو اساس ہے، غور کیا جائے تو پاکستان کا خصوصی اور امتیازی کردار واضح ہو جاتا ہے:

ا۔ سیکولر تصورِ زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی کا ایک بالکل دوسرا تصور ہے کہ کائنات کا اصل حاکم اللہ تعالیٰ ہے، انسان کی حیثیت اس کے خلیفہ کی ہے۔ جو انسان اس خلافت

کی ذمہ داری کو قبول کریں وہ مسلمان ہیں اور اس حاکمِ مطلق کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے اور زندگی کا نظام چلانے کا عہد کرتے ہیں۔

۲۔ اس تصور کا تقاضا ہے کہ زندگی اور حکمرانی کا پورا نظام اللہ کی بتائی ہوئی حدود کے اندر اور اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق انجام دیا جائے اور یہ ہدایت زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ہے، کوئی دائرہ اس سے باہر نہیں۔

۳۔ اجتماعی زندگی میں حکمرانی کا یہ اختیار کسی خاص فرد، خاندان، گروہ یا طبقے کو نہیں دیا گیا بلکہ یہ اختیار ملک کے تمام عوام کو دیا گیا ہے، جن کی مرضی سے اور جن کے منتخب نمائندوں کے ذریعے اسے انجام دیا جائے گا۔

۴۔ زندگی اور تمام وسائل کی حیثیت ایک امانت کی ہے اور امانت کے تصور میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں کہ جس نے یہ امانت دی ہے اصل فیصلہ کرنے والا وہی ہے اور اس امانت کو اس کی ہدایت کے مطابق ادا ہونا چاہیے، اور دوسرے یہ کہ اس امانت کے ساتھ جواب دہی بھی لازمی ہے اور اس فریم ورک میں یہ جواب دہی دُہری ہے، یعنی ایک اللہ کے سامنے اور دوسرے عوام کے سامنے جن کے ذریعے اس امانت کو استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۵۔ آخری چیز یہ ہے کہ اس طرزِ حکمرانی اور طریقۂ فیصلہ سازی کا اطلاق ریاست اور اس کے تمام اداروں پر یکساں ہے۔ ریاست کے لفظ کا استعمال یہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں اختیار عوام کو دیا گیا ہے وہیں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ریاست کے جتنے بھی ادارے ہیں وہ اپنے اپنے دائرے میں اس امانت کے امین اور اس کے سلسلے میں جواب دہ ہوں گے۔

واضح رہے کہ جس مثالیے (Paradigm) کو اس قرارداد میں پیش کیا گیا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں مدینہ کی ریاست کے قیام سے لے کر

آج تک اُمت کا یہی نقطۂ نظر رہا ہے۔

چیف جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلیس (Alvin Robert Cornelius) مسلمانوں کے اس امتیازی طرزِ عمل کو یوں بیان کرتے ہیں:

> اسلامی ریاست کی بنیاد، خود مذہب کی آمد کے ساتھ ہی رسول ؐاللہ کو اللہ کی طرف سے براہِ راست ہدایت کے ذریعے مکمل جزئیات کے ساتھ ڈال دی گئی تھی۔ جن کو ایسی روشن بصیرت، فہم کی گہرائی اور ذہنی قوت مرحمت کی گئی تھی کہ ۱۰ سال کے مختصر عرصے میں قرآنی ہدایت اور رسول ؐاللہ کے عمل کی روشنی میں حکومتی نظم و ضبط، قانون اور خارجہ اُمور چلانے کے اصول، یعنی ایک ایسی سلطنت کے تمام لوازمات جو پورے عرب پر حاوی تھی، بیان کردیے گئے تھے۔ (Chief Justice Cornelius of Paksitan: An Analysis with Letters and Speeches، مرتبہ: رالف برے بنٹی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۹ء، ص۲۸۹)

خود قائداعظمؒ نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکن، بھارت) کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اسلامی تصورِ ریاست کو اس طرح واضح کیا تھا:

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تکمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی، نہ کسی شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرسکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکومت ہے۔ (ملاحظہ ہو: قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے؟ مرتبہ: حمید رضا صدیقی، ناشر: کاروان، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۸۱)

قراردادِ مقاصد کے محرک جناب لیاقت علی خان نے قرارداد پیش کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ بھی قرارداد کی منظوری کے اُس موقعے کو ملک کی زندگی کا اہم واقعہ

سمجھتے تھے: ''اہمیت کے اعتبار سے صرف حصولِ آزادی کا واقعہ اس سے بلند تر ہے'' کہہ کر انھوں نے فرمایا تھا:

> پاکستان اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ برعظیم کے مسلمان اپنی زندگی کی تعمیر اسلامی تعلیمات اور روایات کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ دنیا پر عملاً واضح کر دینا چاہتے تھے کہ آج حیاتِ انسانی کو طرح طرح کی جو بیماریاں لگ گئی ہیں، ان سب کے لیے اسلام ہی اکسیرِ اعظم (Panacea) کی حیثیت رکھتا ہے۔

انھوں نے میکیاولی کے تصورِ سیاست کے مقابلے میں اسلام کے اصولِ حکمرانی کی بنیاد پر ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھنے کے عزم کا اظہار کیا اور صاف الفاظ میں کہا: ''ہماری ریاست کی بنیاد یہ ہے کہ تمام اختیار اور اقتدار ذاتِ الٰہی کے تابع ہونا لازمی ہے اور اس طرح مملکت کے وجود کو خیر کا آلۂ کار ہونا چاہیے، نہ کہ شر کا''۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ''ہم پاکستانیوں میں اتنی جرأتِ ایمانی موجود ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام (انسانی) اقتدار اسلام کے قائم کردہ معیارات کے مطابق استعمال کیا جائے، تاکہ اس کا غلط استعمال نہ ہو سکے''۔

ہماری ان گزارشات سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ قراردادِ مقاصد کوئی روایتی قرارداد یا محض ایک دستور کے لیے مقدمہ نہیں تھی، بلکہ ایک نئے تصورِ زندگی کو ریاست کی بنیاد بنانے کا اعلان اور اس اعلان کے مطابق ایک دستور کی تدوین اور نظامِ حکمرانی کے قیام کے لیے واضح اور حتمی حکم نامہ ہے۔

یہاں ضمناً ہم یہ وضاحت بھی کر دیں کہ قراردادِ مقاصد کے اصل مسودے میں لفظ 'اسٹیٹ' موجود ہے اور اب بھی دستور کی دفعہ ۲۔اے میں جس قرارداد کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قرارداد انھی الفاظ کے ساتھ ہے، جو ۱۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو دستور ساز اسمبلی میں منظور کی گئی تھی اور جس میں سے قرارداد کی منظوری سے قبل ''اسٹیٹ'' کے لفظ کو نکلوانے کے لیے کانگریس کے رکن جناب پروفیسر چکرورتی نے ایک ترمیم پیش کی تھی، کہ اسے 'عوام' سے بدل دیا

جائے۔ آج بھی یہ اصل 'قراردادِ مقاصد' میں موجود ہے۔ دستور کے ضمیمے میں جو قرارداد دی گئی ہے، وہ انھی الفاظ میں ہے جن میں وہ اصلاً منظور کی گئی تھی۔ اس میں 'ریاست' کے ساتھ 'عوام' کا ذکر بھی ہے۔ البتہ بعد میں جب دستور میں اس قرارداد کو بطورِ دیباچہ شامل کیا گیا تو 'ریاست' کا لفظ نکال دیا گیا۔ ضمناً یہاں یہ بھی وضاحت کردوں کہ یہ تبدیلی ۱۹۵۶ء کے دستور میں کی گئی تھی اور فاضل جج جسٹس جواد ایس خواجہ کا یہ خیال درست نہیں کہ یہ تبدیلی ۲۴ سال بعد ۱۹۷۳ء میں کی گئی ہے۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء دونوں کے دساتیر نکال کر دیکھ لیں ان میں 'ریاست' کا لفظ نہیں ہے۔ میری ذاتی رائے میں 'ریاست' کا لفظ رہنا چاہیے تھا، اس لیے کہ عوام کے ذریعے اس اختیار کے استعمال کی بات قرارداد کے دیباچے اور آگے کی ہدایات دونوں میں موجود ہے۔

قراردادِ مقاصد کا اصل جوہر اور اساس یہی تصورِ کائنات، تصورِ زندگی اور سیاسی نظام کا تصور ہے اور یہ جدید عالمی سیاسی تناظر میں ایک حقیقی مرکزِ ثقل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایک تبدیلی سے ہر چیز بدل جاتی ہے کہ اب ہماری آزادی ان حدود کی پابند ہے، جو قرآن و سنت نے ہمارے لیے متعین کی ہیں۔ آزادی برحق اور عوام کا یہ اختیار کہ وہ ہی حکمرانوں کا انتخاب کریں اور ان کا احتساب کریں اپنی جگہ مسلم، لیکن عوام اور اربابِ اقتدار، افراد اور ادارے سب حدود اللہ کے پابند کر دیئے گئے ہیں۔ سب کو وہ مقصد اور مشن دے دیا گیا ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ بھیجے اور جس کا مکمل ترین اظہار نبی اکرم ﷺ کی ذات، تعلیمات اور نمونے میں ہے۔

قراردادِ مقاصد کی باقی تمام شقیں اس بنیادی اپروچ کی وجہ سے بالکل مختلف معنویت رکھتی ہیں اور اگر الفاظ میں دنیا کے دوسرے دساتیر سے کچھ مماثلت نظر آتی ہے، تو وہ بھی صرف ظاہری ہے۔ جوہری اعتبار سے ان سب کا مفہوم حدود اللہ کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ ویسے تو شکل و صورت کے اعتبار سے ایک مسلمان اور کافر میں بہت سی چیزیں مشترک اور مماثل ہیں، لیکن تصورِ زندگی اور حلال و حرام کی حدود دونوں کو دو مختلف شخصیتیں بنا دیتے

ہیں۔ اسی طرح قرار دادِ مقاصد اور خصوصیت سے اس کے اساسی عقیدے نے ہر چیز کا رُخ بالکل بدل دیا ہے۔

- قراردادِ مقاصد نے اس بنیادی حقیقت اور پاکستان کے دستور اور حکمرانی کے لیے نئے مثالیے کی نشان دہی کے بعد پاکستان کے سیاسی نظام کا جو نقشہ دیا ہے وہ یہ ہے:

۱۔ مملکت اپنے اختیارات اور اقتدار کو جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

۲۔ جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پوری طرح عمل کیا جائے گا۔

۳۔ جس کی رُو سے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کے لائق بنایا جائے گا۔

۴۔ جس کی رُو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مذہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔ نیز اقلیتوں اور پس ماندہ طبقوں کے جائز حقوق کو تحفظ ملے گا۔

۶۔ جس کی رُو سے وفاق کے علاقوں کی حفاظت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جن میں اس کے بر و بحر فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ کیا جائے۔

ان چھ بنیادوں پر پاکستان کی علاقائی سالمیت اور عوام کی خوشحالی اور اقوام عالم میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کرنے اور امنِ عالم کے قیام میں اپنا کردار ادا کرنے کے مقاصد کے حصول کو ملک و قوم کا ہدف اور منزل مقرر کیا گیا۔

واضح رہے کہ قرار داد میں نظریاتی ریاست کی تشکیل کے باب میں ابتدائیہ کے علاوہ دو دفعات نظریاتی ریاست میں مسلم معاشرے کی تشکیل سے متعلق ہیں، اور دو دفعات غیر

مسلموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ۔ ایک دفعہ عوامی نمائندہ حکومت اور عوام کے سرچشمہ قوت ہونے کے بارے میں ہے۔ایک کا تعلق سب شہریوں کے لیے بنیادی حقوق کی ضمانت سے ہے۔ایک عدلیہ کی آزادی کے بارے میں ہے،ایک علاقائی حدود کے تعین اور ان کی حفاظت سے متعلق ہے،اور ایک مملکت کے وفاقی نظام کی وضاحت کرتی ہے۔یہی تمام پہلو دستور کے وہ بنیادی خصائص (Features) ہیں، جن سے ہمارا سیاسی اور تہذیبی وجود عبارت ہے اور جن میں کوئی تبدیلی کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔قرارداد اور دستور کے یہ پہلو ہر چیز پر غالب اور حکمران ہیں اور ان کی حفاظت عوام، پارلیمنٹ، حکومت اور عدلیہ ہر ایک کی ذمہ داری ہے۔

(ستمبر ۲۰۱۵ء)

نظریاتی اساس، دستور پاکستان اور قرار دادِ مقاصد

پاکستان میں آئینی اداروں کے درمیان محاذ آرائی بار ہا دیکھنے میں آتی رہی ہے۔ پہلا کیس اس وقت سامنے آیا جب چوہدری غلام محمد نے بطور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کو برطرف کر دیا اور منتخب اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ اسپیکر قومی اسمبلی مولوی تمیزالدین نے گورنر جنرل کے اس اقدام کو عدالت میں چیلنج کر دیا۔ تاہم چیف جسٹس محمد منیر نے نظریہ ضرورت کا سہارا لے کر گورنر جنرل کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ بعد کے ادوار میں بھی کئی مراحل پر ایسے ہی تنازعات دیکھنے میں آئے۔

ایسا ہی ایک موقع ۲۱ویں آئینی ترمیم کے بارے میں درخواستوں کی سماعت کے دوران پیش آیا۔ ۲۱ویں ترمیم کے بارے سپریم کورٹ کے فیصلے میں جسٹس ثاقب نثار نے جو ۷ارکنی فل کورٹ کے رکن تھے اور بعد میں چیف جسٹس آف پاکستان بنے، اپنے فیصلے میں قرارداد مقاصد اور ریاست کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیئے جانے پر ۱۹۷۳ء کی پارلیمنٹ کے منظور کردہ متفقہ آئین پر سوالات اٹھادیے کہ ۱۹۷۳ء کی پارلیمنٹ آئین بنانے کی اہل نہیں تھی۔ سوشلزم کو اپنے منشور میں معیشت قرار دینے والی پیپلز پارٹی ریاست کا مذہب اسلام کیسے قرار دے سکتی ہے، وغیرہ۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ آئین کی محافظ عدلیہ ہے یا پارلیمنٹ۔ یہ اور اس طرح کے کئی اور سوالات نے پاکستان کی سیاسی اور علمی فضا میں پہلے سے موجود کنفیوژن کو اور زیادہ نمایاں کیا۔

پروفیسر خورشید احمد پاکستانی سیاست میں نصف صدی سے زائد متحرک رہے ہیں۔ علم ودانش کی سطح پر پاکستان، اس کے دستور، نظریہ پاکستان اور قرار داد پاکستان کے تصورات کی وہ نہ صرف حفاظت کرتے رہے بلکہ وقتاً فوقتاً اٹھائے جانے والے سوالات واعتراضات کے ہمیشہ ہی جوابات دیتے رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں انہوں نے جسٹس ثاقب نثار کے اٹھائے گئے تمام سوالات اور غلط فہمیوں پر تفصیل سے اور دلائل کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔

قراردادِ مقاصد اور دستور پاکستان

'قراردادِ مقاصد' ایک تاریخی دستاویز ہی نہیں، ایک ایسا آئینہ بھی ہے، جس میں تحریکِ پاکستان کے اصل مقصد اور منزل کی ایک واضح تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

'قراردادِ مقاصد' اور اس کی روشنی میں بننے والے دستور کا یہی وہ امتیازی پہلو ہے، جو اس کے اسلامی، جمہوری اور فلاحی تصور کو اس کی ناقابلِ تغیر شناخت بنادیتا ہے، اور انتظامی بندوبست کو ایک ثانوی حیثیت دیتا ہے، جس میں حسبِ ضرورت تبدیلی اور ترمیم ہوسکتی ہے، مگر اس مملکت کی نظریاتی بنیاد اور اس کو مستحکم کرنے والی دستوری دفعات میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، جو اس شناخت کو مجروح کرنے والی ہو۔ پاکستان کا وجود تحریکِ پاکستان کا نتیجہ ہے اور اس تحریک میں پورے برعظیم کے مسلمانوں نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کی تھی۔ اس ملک کا قیام ایک معاہدۂ عمرانی کا نتیجہ ہے، جسے کسی مصلحت یا وقتی رو کے نتیجے میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ ریاست کے تمام اداروں کی ذمہ داری ہے کہ اس بنیاد کی حفاظت کریں اور اس شناخت کو روشن تر کرنے کی کوششیں کریں اور اس کو کمزور کرنے یا اس کی شکل بگاڑنے کی ہر کوشش کا پوری قوت سے مقابلہ کریں۔ ہر ادارے کے جواز کا انحصار اس بنیادی سوچ سے وفاداری پر ہے۔ ہر ادارہ قرآن وسنت کی بالادستی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ حدود کی پاس داری کا ذمہ دار ہے۔ پارلیمنٹ، انتظامیہ اور عدلیہ ہی نہیں، پارلیمنٹ کو منتخب کرنے والے عوام بھی ان حدود کے دائرے ہی میں اپنا اختیار استعمال کرنے کے پابند ہیں۔

اللہ کی حاکمیت اور اس کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست کا اپنا مزاج اور اپنا نظام ہے۔ اس ریاست کو دوسروں کے معیارات کا تابع کرنا اس عہد سے بے وفائی اور صریح ظلم ہوگا جو اس مملکت کی بنیاد ہے۔ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے، لیکن یہ اتنی ہی بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ ایک شخص محض اس دعوے کی بنیاد پر کہ میں آزاد ہوں، اپنی آزاد مرضی سے اپنے آپ کو کسی دوسرے کی غلامی میں نہیں دے سکتا اور نہ خود اپنی جان لے سکتا ہے۔ خودکشی

ہر مہذب معاشرے میں ایک جرم ہے اور انسانوں کی فروخت رضامندی سے بھی ناقابلِ قبول عمل ہے۔ اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت اور تمام اختیارات کو امانت تسلیم کرنے کے بعد یہ حق مانگنا کہ: ''فلاں ادارہ 'سپریم' ہے اور وہ دستور میں ترمیم کے نام پر جو تبدیلی چاہے کر سکتا ہے'' فی الحقیقت امانت اور خلافت کے تصور ہی کی نفی ہے۔ اللہ کی حاکمیت کے اقرار کے بعد وہ تمام حدود محترم ہو جاتی ہیں جو قرآن و سنت نے مقرر فرمادی ہیں۔ اس لیے ہماری آزادی کا دائرہ ان حدود کے اندر رہے، ان کے باہر نہیں۔

دستورِ پاکستان میں 'قراردادِ مقاصد' کا بطور دیباچہ اور دفعہ ۲(ا) کے طور پر شامل کرنا اسے دستور کا وہ ترازو بنادیتا ہے، جس پر مطلوب اور نامطلوب کا تعین کیا جائے گا۔ جس طرح عدلیہ دستور کی تخلیق (Creature) ہے، بالکل اسی طرح پارلیمنٹ، انتظامیہ اور فوج بھی اس کی تخلیق ہیں، حتیٰ کہ عوام بھی دستور کے تحت ہی اپنے حکمرانی کے اختیارات استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ اسلامی نظریہ اور اسلام کے اصولوں کی روشنی میں جمہوریت، عدلِ اجتماعی، قانون کی حکمرانی اور عوامی فلاح و بہبود کے اہداف وہ ناقابلِ تغیر پہلو ہیں، جن کے بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دستور میں قرآن و سنت کے احکام کے خلاف قانون سازی کی واضح طور پر تحدید کر دی گئی ہے۔ اسی طرح بنیادی حقوق کو مجروح کرنے والی قانون سازی کے اختیار سے مقننہ کو محروم کیا گیا ہے۔ دفعہ ۶ میں دستور کو توڑنے، اس کو تہ و بالا (Subvert) کرنے، معطل (Suspend) کرنے، غیر مؤثر کرنے، یا اسی نوعیت کے عمل میں کسی قسم کی معاونت کو جرم اور غداری قرار دیا گیا ہے۔ اس پابندی کا اطلاق ہر فرد اور ادارے پر ہے: بشمول انتظامیہ، فوج، مقننہ اور عدلیہ۔

دستورِ پاکستان میں صرف یہی ایک جرم ایسا ہے، جسے دفعہ ۱۲(۲) کی رُو سے اطلاق بہ ماضی کی حُرمت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، یعنی دستور ۱۹۷۳ء میں بنا ہے مگر اس کا اطلاق ۱۹۵۶ء سے ہوگا، جب پاکستان میں پہلا دستور نافذ ہوا تھا۔ نیز عدالتوں کو بھی ایسے اقدام کے لیے بعد از عمل جواز (Validation) پر پابندی لگادی گئی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرنے کی

ضرورت ہے کہ صدرِ مملکت، وزیراعظم، وزرااور پارلیمنٹ کے ارکان کے حلف نامے میں دستور کی پابندی اور اس کے مطابق کام کرنے کے عہد کے ساتھ ساتھ، دستور کے تحفظ اور دفاع اور اسلامی نظریئے کے تحفظ کا عہد بھی لیا جاتا ہے۔ کیا یہ تمام اُمور اس بات کا ثبوت نہیں ہیں کہ اسلام جو پاکستان کی بنیاد ہے اور 'قرار دادِ مقاصد' نظامِ حکمرانی کے جن اصولوں اور حدود کی نشان دہی کرتے ہیں، وہ دستور کی اساس اور اس کے ناقابلِ تغیر حصوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی ان کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو روکنے کا کوئی نہ کوئی انتظام ہونا چاہیے۔

منتخب نمائندوں پر غیر منتخب عدلیہ کی بالادستی کی بحث

قانون کے دائرے میں اس کا معروف طریقہ یہی ہے کہ عدلیہ، دستور کے محافظ کے طور پر اپنا کردار ادا کرے۔ البتہ حالات کو دیکھ کر عدلیہ دونوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کر سکتی ہے، یعنی یہ کہ وہ کسی ترمیم کو پارلیمنٹ کو دوبارہ غور کرنے کے لیے بھیج دے، تاکہ پارلیمنٹ خود اصلاح کرے، جیسا کہ اٹھارھویں ترمیم کے سلسلے میں عدالت عظمیٰ نے کیا۔ بصورتِ دیگر ایسی ترامیم کو دستور کی اصل سے متصادم ہونے کی حد تک غیر مؤثر کرنے کا اختیار عدلیہ کو حاصل ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض کہ اس طرح 'منتخب نمائندوں' پر 'غیر منتخب عدلیہ' کی بالادستی کا نظام قائم ہو جائے گا، خلطِ مبحث سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اگر دفعہ ۸ کے تحت پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کو کالعدم قرار دینے سے منتخب نمائندوں کی بے توقیری نہیں ہوتی اور ان پر 'غیر منتخب' کی بالادستی صادق نہیں آتی، اگر وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کی رُو سے قرآن وسنت سے متصادم قانون مہلت کے ختم ہوتے ہی غیر مؤثر ہو جاتا ہے، اور اس سے پارلیمنٹ کے اختیارات پر کوئی ضرب نہیں لگتی، تو دستوری ترمیم کے سلسلے میں عدلیہ کے اقدام کو 'عدالتی جارحیت' اور عدالتی استبداد، (Judicial autocracy) کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

اگر غیر منتخب عدلیہ، پارلیمنٹ کے اکثریت سے منظور کردہ قانون کو خلافِ قانون قرار

دے کر مطلق العنان نہیں بنتی تو دستوری ترمیم کے باب میں کیسے اس الزام کی سزاوار ہو سکتی ہے؟ عام حالات میں دستوری ترمیم سیاسی عمل ہی سے ہونی چاہیے۔ لیکن اگر مقننہ اپنے اختیارات سے تجاوز کرتی ہے تو دستور ہی میں طے کردہ گرفت کرنے اور توازن قائم کرنے کے نظام کے تحت اس کے ہاتھ کو کیسے روکا جاسکتا ہے کہ وہ بھی دستور اور قانون ہی کی پیداوار اور تخلیق ہے اور ان کی پابند بھی۔ پھر عدلیہ بھی اسی دستور سے اپنے اختیارات حاصل کررہی ہے، جس دستور سے پارلیمنٹ، حکومت اور عوام حاصل کرتے ہیں۔

اگر ایک منتخب صدر، وزیراعظم، رکن پارلیمنٹ کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو کیا غیر منتخب پولیس اس کے خلاف قانونی کارروائی نہ کرے؟ کیا غیر منتخب الیکشن کمیشن، منتخب ارکان کی بے ضابطگیوں پر احتساب نہ کرے؟ کیا غیر منتخب آڈیٹر جنرل منتخب حکومت کی بدعنوانی یا بے قاعدگی پر گرفت نہ کرے؟ ریاست کا ہر ادارہ اپنے دائرے میں اپنے اختیارات کو استعمال کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹ بھی اپنے دائرۂ اختیار سے اگر تجاوز کرتی ہے تو عقل اور عدل کا تقاضا ہے کہ اس پر گرفت کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ عوام کا احتساب اور انتخابات میں محاسبہ بھی ایک حقیقت ہے، لیکن وہ احتساب کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ مختلف معاملات کے سلسلے میں اپنے اپنے دائرے میں احتساب اور گرفت کی دوسری شکلیں بھی ہیں، جو معروف ہیں۔ ایسی تمام صورتیں دستور کے نظام کا حصہ ہیں، اس لیے محض منتخب اور غیر منتخب کے حوالے سے پارلیمنٹ کو کھلی چھوٹ نہیں دی جاسکتی۔

> فاضل جج محترم میاں ثاقب نثار صاحب نے اپنے نوٹ میں بطور دلیل یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ بلاشبہ ایک اسلامی معاشرے میں مسلم آبادی کے لیے یہ ایک طے شدہ امرِ واقعہ ہے کہ پوری کائنات پر خودمختاری اور فرماں روائی اللہ وحدہ کو سزاوار ہے۔ لیکن اس الہامی اصول کی حدود کے اندر ان معاملات میں منتخب نمائندے ہی اقدام کرنے کے مجاز ہیں، کوئی اور نہیں۔ اسی کا اطلاق دستوری ترامیم پر بھی ہوتا ہے۔

ہم بڑے ادب سے عرض کریں گے اور اسلامی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اربابِ اقتدار کے قرآن وسنت سے انحراف کے معاملات پر عوام الناس نے اپنے انداز میں، اور علما، فقہا اور عدلیہ نے اپنے انداز میں احتساب کیا ہے اور ہر دور میں کھلے عام یہ احتساب کرنا ان کی ذمہ داری رہی ہے۔

دورِ خلافتِ راشدہؓ میں آزاد عدلیہ کا قیام وجود میں آ گیا تھا اور خلیفۂ وقت بھی عدلیہ کے سامنے اسی طرح جواب دہ تھا جس طرح کوئی دوسرا فرد۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی عام افراد کی طرح قاضی کے سامنے پیش ہوئے۔ ہماری تاریخ میں، ججوں کے وضع کردہ قوانین (Judge-made law) کا ایک بڑا کردار ہے۔ اسلام نے تو اربابِ اختیار کے باب میں اطاعت کے لیے اصول ہی یہ طے کیا ہے کہ:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ [ترمذی، کتاب الجہاد]

کسی انسان کی اطاعت جائز نہیں، اگر اس کے نتیجے میں اللہ کی نافرمانی واقع ہوتی ہو۔

اسلامی حکمرانی کا ایک بنیادی اصول قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (النساء۴:۵۹)

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر کسی معاملے میں تمھارے اور ان کے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو، اگر تم ایمان رکھتے ہو، اللہ اور آخرت کے دن پر۔ یہ بہتر ہے اور بلحاظ انجام بھی اچھا ہے۔

غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔ اصحابِ امر کے اختلاف اور دلیل سے ان سے مجادلہ اور مباحثہ زندگی کی ایک حقیقت ہی نہیں، بلکہ ایک جائز

حق بھی ہے۔ لیکن آخری فیصلے کے لیے معیار اللہ اور اس کے رسولؐ کے ارشادات ہی ہیں، اور فطری طور پر اس کے جائزے اور تحکیم کے لیے کوئی نہ کوئی ادارہ ہونا چاہیے۔ ہماری تاریخ میں علما، فقہا اور قاضی حضرات یہ خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ آج کے دور میں جب قانون سازی کے ادارے انتخابی بنیادوں پر وجود میں آگئے ہیں، تو ایسے منظم نظام کی ضرورت دوچند ہو جاتی ہے۔ ہمارے دور کے اہلِ علم نے اس نازک اور بنیادی ذمہ داری کے تعین کے لیے عدلیہ ہی کو مناسب ادارہ تجویز کیا ہے۔ خود ہمارے دستور میں 'وفاقی شرعی عدالت' کا وجود اس کی مثال ہے۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے اس سلسلے میں جس رائے کا اظہار کیا تھا، اس سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ تعبیرِ دستور کے مسئلے پر کلام کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

> رہے عام دستوری مسائل، جن میں شریعت کوئی منفی یا مثبت احکام نہیں دیتی، ان میں مقننہ کو آخری فیصلہ کن اختیارات دے دینا بحالاتِ موجودہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک غیر جانب دار ادارہ ایسا موجود ہونا چاہیے، جو یہ دیکھ سکے کہ مقننہ نے کوئی قانون بنانے میں دستور کے حدود سے تجاوز تو نہیں کیا ہے اور ایسا ادارہ ظاہر ہے کہ عدلیہ ہی ہو سکتا ہے۔ (اسلامی ریاست، مولانا مودودی، ص۵۳۹)

تاریخی نظائر کا معاملہ بہت نازک ہے۔ ہر دور کے اپنے حالات، مسائل اور امکانات ہوتے ہیں، اور شریعت نے ان کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملوکیت (بادشاہت) کے باوجود اسلامی قانون کی برکت سے اس دور میں بھی اربابِ اقتدار پر بڑی گرفت رہی۔ یوں قانون کی حکمرانی اور بالادستی کی اعلیٰ نظیریں ہر دور میں مل جاتی ہیں۔ خلافت عثمانیہ کے بارے میں امریکی مصنف پروفیسر جان لوئیس اسپوزیٹو (John Louis Esposito) اور پروفیسر جان وول (John O. Voll) اپنی کتاب "Islam and Democracy" میں لکھتے ہیں:

> بعد کی صدیوں میں عثمانی سلطنت کے دور میں اس معاہدے کے مفہوم کو قانونی

حیثیت دے دی گئی۔ سلطنت ایک اسلامی سلطنت تھی اور اس کا سربراہ سلطان اسلامی قانون کے ماتحت تھا اور اس کا یہ اختیار تسلیم کیا جاتا تھا کہ انتظامی فرمان جاری کرے جو قانون کے مثل ہوتے تھے۔اِس سلطانی نظام کے علما کو بہر حال یہ حق حاصل تھا جو عموماً سیاسی وجوہ کی بناپر استعمال نہیں کیا جاتا تھا کہ بادشاہ کے جاری کردہ کسی ضابطے کو اگر اُن کی رائے میں وہ اسلامی قانون کے مطابق نہیں ہے ناجائز قرار دیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر سلطنت میں سرکاری علما کا سربراہ شیخ الاسلام ایسے احکامات جاری کر سکتا تھا جس میں بنیادی اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سلطان کو معزول کیا گیا ہو۔ گو کہ یہ اختیار خال خال ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ اختیار سلطان ابراہیم (۱۶۴۸ء)، محمد چہارم (۱۶۸۷ء)، احمد سوم (۱۷۳۰ء)، سلیم سوم (۱۸۷۷ء) کی معزولی میں حقیقتاً استعمال کیا گیا۔اِن رسمی اقدامات میں سلطان کے اختیارات پر تاریخی قدغن اس واقعے کی بنیاد پر عائد کی گئی کہ علما دستور کے نمائندے تھے، یعنی اس میں اسلامی قانون کا مکمل اظہار ہوتا تھا۔ اسلامی ورثے میں یہ اختیارات کی علیحدگی کی امکانی جہتوں کو ظاہر کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے، تاریخی نظائر سے مقصود اس امر کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ مختلف اَدوار اور زمانوں میں اپنے اپنے حالات کے مطابق، اصل مسئلے کا حل نکالنے کی کوششیں کی گئی ہیں، اور آج ہمارے اپنے حالات کی روشنی میں اس امر کی ضرورت ہے کہ مقننہ کی قانون سازی کو، دستور کی حدود میں رکھنے اور بنیادی دستوری ڈھانچے کی حفاظت کے لیے اداراتی (Institutional) انتظام ہو۔ اعلیٰ عدلیہ یہ خدمت انجام دے سکتی ہے اور اس میں اس کی صلاحیت پیدا کرنے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ خود عدلیہ پر بھی عوام، میڈیا، علما اور سول سوسائٹی کی نگاہ اسی طرح ہونی چاہیے، جس طرح پارلیمنٹ اور حکومت پر رکھی جانی ضروری ہے۔

دستور سازی کا مرحلہ: غور طلب پہلو

ہر جج ہی نہیں، ہر صاحبِ علم کا حق ہے کہ وہ اپنے مطالعے اور تجزیے کی روشنی میں اپنی دیانت دارانہ رائے قائم کرے اور اس کا بلا تکلف اظہار کرے۔ اختلاف رائے اگر غور وفکر کی نئی راہیں کھولنے کا ذریعہ بنے تو ایک بڑی نعمت ہے۔ ہر علمی بحث و مباحثے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو ایسے بہت سے گوشوں پر سوچنے کی تحریک ہوتی ہے، جو بالعموم نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ محترم جسٹس میاں ثاقب نثار صاحب نے بالعموم اپنی رائے کا اظہار دلائل سے اور سلیقے سے کیا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'قراردادِ مقاصد' کی طرح خود 'دستورِ پاکستان' کے بارے میں ان کی متعدد آرا نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ وہ چونکا دینے والی ہیں۔ چونکہ ان آرا کا اظہار عدالتِ عظمیٰ کے ایک بڑے وقیع فیصلے (۱۸ویں ترمیم پر سپریم کورٹ کے فیصلے) کا حصہ ہے، اس لیے اس پر کلام، تلاشِ حق کی جستجو کا ایک ناگزیر حصہ بن گیا ہے۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ دستور کے بارے میں ایک خاص نوعیت کا بیانیہ زیر بحث مسائل کی تفہیم اور تنقیح کے لیے کہاں تک ضروری تھا۔ نیز بھارت کے دستور کے معتبر اور محترم ہونے اور پاکستانی دستور کے اعتبار نامے (Credentials) کے داغ دار ہونے کے تذکرے سے کتنی روشنی ان تین امور پر پڑتی ہے، جن کے بارے میں عدالت کو رہنمائی دینا تھی اور فیصلہ کرنا تھا۔

دستور میں اصلاح طلب امور

۱۹۷۳ء کا دستور جن حالات میں منظور ہوا، وہ ایک تاریخی کارنامہ تھا۔ تاہم وہ ایک انسانی کوشش تھی۔ بہت سے پہلوؤں سے اس میں کئی خلا اور سقم تھے، جن میں سے کچھ کو ترامیم کے ذریعے دُور کر دیا گیا ہے مگر کچھ اب بھی باقی ہیں، جن کی اصلاح کی کوشش جاری رہنی چاہیے۔

'قرار دادِ مقاصد'، اسلامی تعلیمات واحکام کی تنفیذ اور دستور کے مندرجات کے سلسلے میں بھی کچھ مسائل اور اُلجھنیں تاحال موجود ہیں۔ خصوصیت سے وہ اُمور جن کا تعلق دفعہ ۴۵ اور دفعہ ۲۴۸ سے ہے۔ ایسے تمام ہی اصلاح طلب اُمور پر توجہ مرکوز رہنی چاہیے۔ پالیسی کے اصولوں میں سے جو چیزیں حقوق کے دائرے میں آنی چاہییں اور جنھیں قابلِ داد رسی (Justiciable) ہونا چاہیے، ان کے لیے کوشش جاری رہنی چاہیے لیکن دستور ایک محترم دستاویز ہے، اس کے بارے میں احترام اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

۱۸ ویں ترمیم کے جائزہ کے دوران دستور سازی سے متعلق مختلف آراء کا جائزہ لیتے ہوئے بھارت کے دستور کے بارے میں جج صاحب کا ارشاد ہے:

> بھارت میں اس کے بانیوں نے دستور تیار کیا تھا۔ اس لیے بھارت کے دستور کی فکر اور ارتقا میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔(۱۸ ویں ترمیم کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ، پیرا ۱۸۵۔اے)۔(ص ۵۳۵)
>
> یاد رہے کہ بھارتی دستور بہت پہلے ۱۹۴۹ء میں تشکیل دیا گیا تھا اور دستور کے بنانے والے وہ لوگ تھے جنھوں نے آزادی کی جدوجہد کی تھی۔ دستور کو اپنی اصل شکل میں بھارت کے دستوری قانون میں اسے خصوصی تقدس کا مقام حاصل ہے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی بروقت دستور بنانے میں کامیاب نہیں ہوئی اور جب ۱۹۵۴ء میں دستور کا مسودہ تیار ہو گیا تو اس طاقت ور اور بے لگام بیوروکریسی نے، جس کا فی الحقیقت پاکستان کی تحریک میں کوئی حصہ نہ تھا، شب خون مارا اور اسمبلی کو برطرف کر دیا۔ لیکن دنیا کا ہر تحریری دستور محترم ہے، اور حکمرانی سے متعلقہ اُمور میں آخری مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔ محض اس بنا پر کہ اس کے بنانے والے تحریکِ آزادی کے قائدین ہیں، وہ غلطیوں اور کمزوروں سے پاک نہیں ہو جاتا۔ ہم بھارت کے دستور کے مشہور ترین شارح پروفیسر باسو کے حوالے سے عرض کر چکے ہیں کہ دستور کے بنانے والے

بلاشبہ تحریکِ آزادی کے قائدین تھے مگر دستور کا تین چوتھائی حصہ '۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ' سے ماخوذ تھا اور باقی حصوں میں بھی دنیا کے کئی دساتیر کی خوشہ چینی کی گئی تھی۔ پھر اسی بھارتی دستور میں ۱۵ ؍اگست ۲۰۱۵ء تک ۱۰، ۲۰ نہیں پوری ۱۰۰ ؍ترامیم ہو چکی ہیں۔ ان میں چار ترامیم ایسی ہیں، جنھیں وہاں کی اعلیٰ عدلیہ خلافِ دستور قرار دے چکی ہے۔

واضح رہے کہ مغربی دنیا کا پہلا تحریری دستور امریکہ کا ہے، جو ۱۷۸۹ء میں نافذ ہوا اور اس میں ۲۲۶ سال میں کل ۲۷ ترامیم ہوئی ہیں۔ پاکستان کے دستور میں جو ۱۹۷۳ء میں نافذ ہوا، ۲۰۱۵ء تک ۲۱ ترامیم ہوئی ہیں۔

کسی دستور کے معیاری ہونے کی بنیاد دستور کے مندرجات پر ہے، محض اس امر پر نہیں کہ اس کے بنانے والے تحریکِ آزادی کے قائدین تھے۔ گذشتہ ۷۰ سال میں ۱۵۰ ممالک آزاد ہوئے ہیں اور بیش تر کے دساتیر ان کی تحریکاتِ آزادی کے قائدین ہی کے بنائے ہوئے ہیں، لیکن کتنے دستور ایسے ہیں، جو بار بار ناکام ہو چکے ہیں اور کتنے ہیں جو بدترین آمریتوں کے قیام کا ذریعہ بنے ہیں۔

پاکستان کی 'قراردادِ مقاصد' بھی تو اس دستور ساز اسمبلی نے بنائی تھی جو تحریکِ پاکستان کے قائدین پر مشتمل تھی اور جن کا انتخاب انھی بنیادوں پر اور اسی طریق کار سے ہوا تھا، جن پر بھارت کی دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی تھی۔ لیکن ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ 'قراردادِ مقاصد' اپنے انقلابی پیغام اور منفرد تصورِ ریاست کے باوجود کیوں معتبر نہ تصور کی جائے؟ اور بھارت کا دستور معتبر اور روشنی کا مینار تصور کیا جائے۔

پاکستان کے دستور کے بارے میں محترم جج صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

> ۱۹۷۳ء کا دستور بانیانِ پاکستان کے نظریات کا اظہار نہیں کرتا تھا بلکہ اس وقت کے سیاسی رہنماؤں کے نظریات کا اظہار کرتا تھا۔ اسے ایک ایسی پارلیمنٹ نے بنایا تھا جس کی اکثریت ایک خاص پارٹی کے ممبران پر مشتمل تھی جو کھلے سوشلسٹ

منشور پر منتخب ہوئی تھی۔ یہ نکتہ کچھ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ آزادی وخود مختاری کے لیے اصل تحریک کا آغاز ایک بالکل مختلف بنیاد پر ہوا تھا، یعنی قائداعظم کا پیش کیا ہوا وژن کہ برعظیم کے مسلمان ہر بامعنی مفہوم میں ایک قوم ہیں اور اس کا حق رکھتے ہیں کہ ایک قومی ریاست بنائیں اور تخلیق کریں۔ تاریخی طور پر بیان کیا جائے کہ اسلامی نظریہ، پاکستان کی تخلیق کا اصل سبب اسلام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جن پارٹیوں نے ۱۹۵۶ء کے دستور بننے سے پہلے انتخابات میں حصہ لیا خاص طور پر مذہبی پلیٹ فارم سے وہ پارلیمنٹ میں مناسب مقام حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی تھیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ (۱۸ویں ترمیم پر سپریم کورٹ کا فیصلہ، ص۱۸، ۸۴، ۳۰۸)

اس کے بعد محترم جج صاحب لکھتے ہیں کہ دستور اسلام اور سوشلزم کا ملغوبہ ہے، ارشاد ہوتا ہے:

جب ہم دستور کا معائنہ کرتے ہیں جیسا کہ وہ اصل میں تحریر کیا گیا تھا تو ہم دیکھتے ہیں مذہبی اصول اور ساتھ ہی ساتھ سوشلسٹ نظریات کا عکاس ہے۔ دستور کی دفعہ ۲ یہ بیان کرتی ہے کہ اسلام ہی ریاست کا مذہب ہوگا۔ اس کے فوراً بعد دفعہ ۳ بتاتی ہے کہ ریاست استحصال کے تمام طریقوں کے خاتمے کو یقینی بنائے گی اور اس بنیادی اصول کی بتدریج تکمیل کو یقینی بنائے گی اور ہر ایک سے اُس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جائے گا۔ اس طرح دفعہ ۳ دراصل دستور کی سوشلسٹ اصل کا اظہار کرتی ہے۔ ہر ایک سے اُس کی قابلیت کے مطابق کام لینا اور کام کے مطابق معاوضہ دینا بلاشبہ مارکسزم اور لینن ازم کا بنیادی اصول ہے (درحقیقت یہ زبان یونین آف سویت سوشلسٹ ریپبلک کے دستور، جیسا کہ وہ اُس وقت تھا، کی دفعہ ۱۲ سے نقل کی گئی ہے جو بلاشبہ کارل مارکس کی تحریرات پر مبنی تھا)۔ استحصال کے تصور کا ایک فنی مفہوم ہے جیسا کہ وہ معاشیات میں کارل مارکس کے نظری کام میں

استعمال کیا گیا ہے۔ یہ حوالہ کسی بھی استحصال یا ہر استحصال کے لیے نہیں ہے بلکہ استحصال کی وہ قسم ہے جو سرمایہ دارانہ طبقہ ورکنگ کلاس کے مفادات کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دفعہ ۲اور ۳ میں کس طرح مفاہمت پیدا کی جائے کیونکہ دونوں اصول دستور کے لیے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح طور پر یہ بنیادی ثنویت ہے۔ مارکسزم مذہب کی تمام شکلوں کو مسترد کرتا ہے کیونکہ وہ صبر اور تکلیف برداشت کرنے کو بڑی خوبی بتاتا ہے جو ایک پُرتشدد اور انقلابی جدوجہد ہے (کمیونسٹ پارٹی جس کا ہراول دستہ بورژوا کا تختہ اُلٹنا ہے)۔ مارکسزم کے ایک مشہور مقولے کے مطابق: مذہب کو افیون بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ ناپسندیدہ حقیقت برقرار رہتی ہے کہ ہمیں مارکسزم اور اسلام کے عقائد کی بنیاد پر آگے بڑھنا ہے۔

ہم نے فاضل جج صاحب کا یہ طویل اقتباس اس لیے دیا ہے کہ ان کے ذہن کا وہ مخمصہ جس سے وہ پریشان ہیں، انھی کے الفاظ میں سامنے آجائے اور جس اُلجھن کی وجہ سے وہ دستور کے بنیادی ڈھانچے کے برملا منکر ہیں، اس کی بنیاد کو سمجھا جاسکے اور اس پر گفتگو ہوسکے۔

'استحصال' (Exploitation) کا لفظ انگریزی زبان میں دو مختلف بلکہ ایک حد تک متضاد مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ مثبت معنی میں یہ لفظ کسی 'چیز کو دریافت کرنا' اور 'ترقی دینے' کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس طرح کہ Exploit resources of country یا Explore new avenues۔ اس کے برعکس دوسرے مفہوم میں، استحصال اور دوسروں کے حقوق پر ناجائز قبضہ یا ان کو حقوق سے محروم رکھنے اور ان کے وسائل سے ناجائز فائدہ اُٹھانا شامل ہے، جس میں ذم کا پہلو ہے اور اس استحصال کی درجنوں شکلیں ہوسکتی ہیں۔ کارل مارکس نے اس کی ایک خاص شکل کو نمایاں کیا ہے، جو اس کی نگاہ میں نظامِ سرمایہ داری کی پہچان ہے اور طبقہ واریت کی بنیاد پر مظلوم اور کمزور طبقات کے حقوق پر بااثر طبقات خصوصیت سے اہلِ سرمایہ کی دست درازیاں ہیں۔ پاکستان کے دستور کی

دفعہ ۳میں یہ لفظ اپنے وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور جس پر All forms of exploitation(استحصال کی تمام صورتوں) کے الفاظ شاہد ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کو صرف ایک مخصوص شکل تک محدود کردیا جائے اور طلسماتی عینک سے وہ تصویر بھی دیکھ لی جائے، جس میں مارکس اور لینن کی شبیہہ جھلکتی ہو!

محترم جج صاحب کے فیصلے کے پیرا گراف ۱۸ اور ۱۹ سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ پاکستان کا ۱۹۷۳ء کا دستور بنانے والے، پاکستان کے اصل معمار نہیں تھے اور وہ صرف ۱۹۷۰ء کے عشرے کی سیاسی نسل کی نمائندگی کرتے تھے۔

۲۔ یہ دستور ایک خاص جماعت کے ذہن کی تخلیق ہے جو سوشلزم کی علَم بردار تھی۔

۳۔ پاکستان کے قیام کی تحریک کا محرک نظریاتی تھا۔ اسلام قیامِ پاکستان کی اصل بنیاد ہے۔

۴۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ان جماعتوں کو قابل لحاظ کامیابی نہ ہوئی جو اسلام کے پلیٹ فارم سے شریکِ انتخاب ہوئی تھیں۔

۵۔ دستور، اسلام اور مارکس ازم، لینن ازم کے دو متحارب تصورات کی زد میں آگیا اور وہ ان دونوں کا ملغوبہ ہے، جو باہم متحارب تصورات اور نظریات ہیں۔

۶۔ ایسے تضادات کی موجودگی میں دستور کا ایک بنیادی ڈھانچا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا تضاد ہے جس نے دستور کو یک رنگی سے محروم کر دیا ہے اور اس میں کسی بنیادی اور مربوط ڈھانچے کا تصور ہی ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نکتہ ۲۱ میں جناب خالد انور صاحب ایڈووکیٹ کے الفاظ میں اسے 'بے راحت شادی' قرار دیا ہے اور یہ فتویٰ بھی اس فیصلے میں موجود ہے کہ ایسی شادی

کا مقدر طلاق ہی ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت سے تو انکار ممکن نہیں کہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی دستور سازی کی ذمہ داری ادا نہ کر سکی اور پھر ۱۹۵۶ء میں جو پہلا دستور بنا، اسے فوجی قیادت نے بیوروکریسی کے تعاون سے منسوخ کر ڈالا۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف وجوہ سے دساتیر منسوخ یا غیر مؤثر ہوتے رہے ہیں اور ہر ناکامی کے بعد ہر زندہ قوم نے اپنے لیے نیا دستور بنایا اور اپنے اصل مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے منزل کی جانب گامزن ہوئی۔ فرانس اور جرمنی اس کی اہم ترین مثالیں ہیں۔

فرانس میں تو اس وقت پانچواں دستور نافذ ہے، لیکن اس عمل کی وجہ سے نیا دستور غیر معتبر نہیں ہو جاتا اور ضروری نہیں کہ نئی نسل کا بنایا ہوا دستور تاریخی حقائق کے ادراک اور قومی عزائم کی ترجمانی کے باب میں اپنے پیش روؤں سے تہی دست ہو۔ فرانس اور جرمنی میں بھی فسطائی قوتوں نے اصل دساتیر کو تار تار کر دیا تھا، مگر پھر فرانس نے اپنے تصور کے مطابق اٹھارھویں صدی کے انقلابِ فرانس ہی کے نعروں اور مقاصد کے اعادے کے لیے نیا دستور بنایا۔ جرمنی اور اٹلی نے ہٹلر اور مسولینی کے دستوروں سے نجات پاکر، اپنے اپنے حالات کے مطابق جمہوری دساتیر کی تدوین کی۔ روس نے کبھی زارِ شاہی دور کے دستور کے تحت زندگی گزاری۔ پھر اشتراکی انقلابِ روس کے جلو میں نیا دستور بنا۔ اسی نظام کے تحت ۱۹۳۶ء میں دوسرا دستور وجود میں آیا۔ پھر ۲۰۰۷ء کا دستور بنا۔ زندگی کے ایسے نشیب و فراز سے بہت سی اقوام کو سابقہ رہتا ہے۔

ہماری تاریخ بھی کچھ ایسے ہی حادثات سے عبارت ہے۔ لیکن یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ 'قراردادِ مقاصد' وہ بنیاد کا پتھر ہے جو ہر دور میں دستور اور نظامِ حکمرانی کے لیے رہنما قوت رہا ہے اور تسلسل کا ذریعہ ہے۔

۱۹۷۳ء کا دستور اور اس کے اہم نکات

۱۹۷۳ء کا دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۶۲ء کے دستور سے جوہری طور پر مختلف مگر ۱۹۵۶ء کے دستور سے بھی بہتر دستاویز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں بہت سے معاملات پر سمجھوتا کیا گیا اور کچھ پہلو سے خامیاں رہیں۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے بعد کے حالات پر نظر رکھی جائے تو اسے ایک مثبت اور تاریخی کامیابی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس وقت کے دستور کی کچھ خامیوں کی نشان دہی محترم جج صاحب نے کی ہے، جن میں متعدد حوالوں سے درست نشان دہی ہے۔ ان میں سے بیش تر خامیوں کی اصلاح دستوری ترامیم کے ذریعے کر دی گئی ہے۔ خصوصیت سے اٹھارھویں ترمیم کے ذریعے اور اس کا اعتراف وادراک محترم جج صاحب کے فیصلے میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ارتقا کا ایک فطری عمل ہے۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ یہ دستور تحریکِ پاکستان کی قیادت کا بنایا ہوا نہیں ہے، اس سے دستور بے توقیر نہیں ہو جاتا۔ ہماری نگاہ میں تاریخی تسلسل کی وجہ سے اس دستور کو فطری ارتقائی عمل کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

جس اسمبلی نے یہ دستور منظور کیا، اس کے تمام ارکان نے اسے متفقہ طور پر منظور کیا تھا، صرف تین ارکان ایسے تھے، جنہوں نے دستخط نہیں کیے۔ گویا انہیں پوری اسمبلی کی تائید حاصل تھی۔

ہم پھر یہ بات عرض کریں گے کہ کسی دستور کے معیاری یا غیر معیاری اور معتبر یا غیر معتبر ہونے کا انحصار محض اس بات پر نہیں ہوتا کہ اس کے بنانے والوں میں کون شریک تھا، جو اپنی جگہ اہم ہے مگر فیصلہ کن نہیں، بلکہ اصل اہمیت دستور کے مندرجات کی ہے اور اسی کسوٹی پر جانچنا چاہیے۔

اس پس منظر میں ہم دواُمور کی طرف خصوصیت سے متوجہ کرنا چاہتے ہیں:

پہلا یہ کہ ۱۹۷۳ء سے اب تک کے دستوری اور سیاسی تجربات اس بات پر شاہد ہیں کہ

۱۹۷۳ء کا دستور ہی ملک اور قوم کو مضبوط سیاسی بنیاد فراہم کر رہا ہے اور ہر انحراف کے بعد اس کی طرف رجوع کیا جارہا ہے۔ اس دستور میں ہر تحریف کے بعد اصل کی طرف مراجعت میں نجات کی راہ موجود ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ 'قرار دادِ مقاصد' اور پاکستان کے اصل اہداف کی روشنی میں دستور میں نئی اصلاحات اور اضافے ہوتے رہیں۔

دوسری بات جس پر غور کرنے اور اللہ کا شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ریاست کی نظریاتی تشکیل اور اسلامی نظریئے کو دورِ جدید میں ریاست اور حکمرانی کے نظام میں سمونے کے سلسلے میں جو پہلا تاریخی قدم 'قرار دادِ مقاصد' کی شکل میں ۱۹۴۹ء میں اُٹھایا گیا تھا، اس نے دستور سازی کے میدان میں وسیع پیمانے پر اثر ڈالا۔ اس کی روشنی میں اللہ کی حاکمیت، قانون سازی میں قرآن وسنت کے کردار، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل نو میں اسلام کے رہنما اصولوں اور اقدار کا کردار، اسلام کے نظامِ انصاف اور عدلِ اجتماعی کو پالیسی کے اصول بنانے کے باب میں نشانِ منزل متعین کرنے کا جو اقدام پاکستان میں اُٹھایا گیا تھا، اس کے اثرات عالمِ اسلام میں بعد میں بننے والے دساتیر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۱۹۴۹ء کی 'قرار دادِ مقاصد' کی منظوری سے پہلے کے دساتیر پر نگاہ ڈالیے، زیادہ سے زیادہ دو چیزیں چند مسلم ممالک کے دساتیر میں ملتی ہیں، یعنی: ''ریاست کا مذہب اسلام ہوگا اور سربراہِ مملکت مسلمان ہوگا''۔ لیکن جمہوریت، حقوقِ انسانی، اجتماعی عدل، تعلیم وتربیت، معیشت اور معاشرت کے باب میں اسلام کا کردار کیا ہوگا، اس باب میں دساتیر خاموش تھے۔ اسی طرح مملکت کا نام ملک کے دینی اور نظریاتی تشخص کا آئینہ دار ہو، یہ بھی ہمیں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس سلسلے میں پہل 'قرار دادِ مقاصد' اور پھر ۱۹۵۶ء کے دستور کی تشکیل میں ہوئی۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ کئی ممالک نے اپنے نظریاتی تشخص کے اظہار کے لیے ملک کے نام میں اسلام کو شامل کیا۔ ۱۹۷۹ء کے انقلابِ ایران کے بعد ایران کو 'اسلامی جمہوریہ ایران' قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں موریطانیہ نے اپنے کو 'اسلامی جمہوریہ' قرار دیا اور دستور کی 'دفعہ ۱' میں اس کی تشریح یوں کی کہ: ''موریطانیہ ایک اسلامی، ناقابلِ تقسیم، جمہوری اور سوشل جمہوریہ

ہے"۔

اسی طرح افغانستان میں اشتراکی روس کے انخلا کے بعد جو دو نظام قائم ہوئے، ان میں سے ایک میں اسلامی امارت (۱۹۹۶ء) اور دوسرے میں اسلامی جمہوریہ افغانستان (۲۰۰۴ء) قرار دیا۔ اگر ان ممالک کے دساتیر کے دیباچے کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اللہ کی حاکمیت کے تصور کا صاف الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے۔ اس طرح ریاست کی پالیسی کے رہنما اصولوں میں بھی اسلام کے اصولوں اور اقدار کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔

محترم جسٹس ثاقب نثار صاحب نے دستور کی ایک اور کمزوری کے طور پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ: وہ ایک خاص جماعت کے ذہن کی تخلیق ہے اور یہ کہ وہ جماعت سوشلزم کی علم بردار تھی جو اسلام کی ضد ہے۔ اس اسلام کی، جو پاکستان کے قیام کا اصل محرک تھا۔ عدالتی فیصلے میں کیے گئے یہ دونوں دعوے محلِ نظر ہیں۔

۱۹۷۳ء کے دستور کی صورت گری کا ہر مرحلہ کھلی کتاب کی طرح موجود ہے اور خود اسمبلی کی کارروائی اور دستوری مسودات، کمیٹیوں کی رپورٹیں، اختلافی نوٹ اور پھر متفق علیہ اعلانات پبلک ریکارڈ کا حصہ ہیں، جن سے ہر کوئی استفادہ کر سکتا ہے۔ ہمیں تعجب ہے کہ اتنی معلومات کی موجودگی میں فاضل جج نے یہ دعویٰ کیسے کر دیا کہ یہ دستور محض ایک جماعت کے ذہن کا عکاس ہے۔

اس دستور کی تو سب سے بڑی خوبی ہی یہ ہے کہ یہ متفق علیہ دستاویز ہے اور ہمیں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسیوں اور متعدد اقدامات سے کتنی ہی شکایت ہو، لیکن یہ ان کا ایک تاریخی کارنامہ ہے کہ انھوں نے دستور سازی کو پارٹی کی سیاست کا شکار نہیں ہونے دیا اور پوری کوشش کی کہ پارلیمنٹ میں موجود تمام جماعتیں اس عمل میں شریک ہوں۔ ان کے نقطۂ نظر کی ہمراہی سے معاملات طے کیے جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی اعلان شدہ پوزیشن سے بار بار پیچھے ہٹنا گوارا کر لیا اور قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے

قربانی دی اور دوسروں کو بھی ہم کار اور ہم راہ رکھنے کے لیے دستور سازی میں دعوت دی۔ ان کا یہی وہ عمل ہے جس نے ۱۹۷۳ء کے دستور کو پیپلز پارٹی کا نہیں پاکستان کی تمام جماعتوں کا اتفاق رائے سے طے کیا جانے والا دستور بنایا۔ ان کے بعد یہی روایت قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ خصوصیت سے اٹھارھویں ترمیم میں، جس کے ذریعے دستور کی بہت سی کج رویوں (Distortions) کو دُور کر دیا گیا اور ۱۹۷۳ء کے وژن سے قریب تر کیا گیا۔ 'قراردادِ مقاصد' کے وژن کی روشنی میں آگے قدم بڑھائے گئے اور یہ کام بھی تمام جماعتوں کے مکمل تعاون اور اتفاق رائے سے ہوا۔ چند اُمور پر اگر اختلاف رہا بھی تو اسے مشترکات کی بنیاد پر قومی اتفاق رائے پیدا کرنے میں حائل نہ ہونے دیا۔

اس سلسلے میں تاریخی حقائق کے نظروں سے اوجھل ہو جانے سے بچنے کے لیے ہم چند اُمور کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں:

۱۹۷۳ء میں دستور سازی کا عمل جب شروع ہوا، تو اس کا آغاز ایک عبوری آئین سے ہوا، جو پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت کے ذہن کا عکاس تھا اور اس میں پارلیمانی نہیں صدارتی نظام کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اسلامی نظریہ، بنیادی حقوق، اداروں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاملہ بھی بہت کمزور تھا۔ لیکن حزبِ اختلاف کی تمام ہی جماعتوں نے ان تمام کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دستور کو صحیح اسلامی جمہوری اور وفاقی اصولوں کے مطابق مرتب کرانے کی جدوجہد کی، چار اُمور مرکزی نوعیت اختیار کر گئے:

۱۔ اسلامی نظریہ اور 'قراردادِ مقاصد' کا کردار۔

۲۔ انسانی حقوق کا مسئلہ۔

۳۔ صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور صوبوں کی خود مختاری کی حدود۔

۴۔ پارلیمنٹ کا کردار اور انتظامیہ، پارلیمنٹ اور عدلیہ کے اختیارات میں توازن۔

کئی مہینے کے مذاکرات، احتجاجوں، اسمبلی کے بائیکاٹ اور نہ معلوم کس کس عمل کے

بعد ۲۰ ؍اکتوبر ۱۹۷۲ء کو حکومت اور حزبِ اختلاف کی تمام جماعتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں دستور سازی کے لیے کیے گئے ۱۴۲ اصولوں پر اتفاق ہوا۔ وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے دستور کے مسودے پر خطاب کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا کہ اسمبلی کی تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین کے اجتماع میں:

> چار دن کی گفتگو اور بحث و مباحثے کے بعد ۱۴۲ بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے ہوا، جسے '۲۰ ؍اکتوبر کی دستوری مفاہمت' کا نام دیا گیا۔ ان تجاویز کا تعلق کم سے کم ۴۰ فی صد حزبِ اختلاف سے تھا جنھیں اکثریتی پارٹی نے قبول کیا۔ (کارروائی قومی اسمبلی، ۱۰؍ اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۶۴)

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ان اصولوں کی روشنی میں دستور کے پورے مسودے پر نظر ثانی کی گئی اور اس طرح ۲۸۰ دفعات پر مشتمل دستور کا مسودہ تیار ہوا۔ حزبِ اختلاف کے مزید اصرار پر ۱۰ سے ۱۵ دفعات میں ترامیم تسلیم کی گئیں اور پھر آخری مرحلے پر ایک بار پھر پالیسی کے بنیادی اصولوں کے متعلق ۱۲ دفعات میں حزبِ اختلاف کے اصرار پر تبدیلی کی گئی۔ آخری دو دنوں میں ایک بار پھر دستور کی سات دفعات میں حزبِ اختلاف کی ترامیم کو قبول کیا گیا۔ بالکل آخری مرحلے پر ججوں کے احتساب کے بارے میں پارلیمنٹ کے کردار کے مسئلے پر حکومت کے موقف کو حزبِ اختلاف نے ماننے سے انکار کیا اور بھٹو صاحب نے کمال دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حزبِ اختلاف کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا۔

اس سلسلے کے دوسرے نکتے پر بھی کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ پیپلز پارٹی نے سوشلزم کو اپنی معاشی پالیسی کی بنیاد قرار دیا اور 'روٹی، کپڑا اور مکان' کے نعرے سے سیاسی فائدہ اُٹھایا۔ عالمی سطح پر اور خود ملک میں ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کے شروع میں سوشلسٹ فکر نے ایک ہلچل مچائی ہوئی تھی اور جماعت اسلامی اور دوسری دینی قوتوں نے سوشلزم کی اس یلغار کا سیاسی، علمی اور مکالماتی سطح پر بھرپور مقابلہ کیا۔ لیکن پیپلز پارٹی کو 'مارکسزم اور لینن ازم' سے مربوط فکر اور سیاسی اسٹرے ٹیجی کا علَم بردار کہنا

اور پاکستان کے دستور میں سوشلزم کے وجود کا دعویٰ کرنا ایسے دعوے ہیں جو دلیل سے محروم ہیں۔

مارکسزم ایک مربوط فلسفہ ہے جس کا اپنا تصورِ کائنات، تصورِ تاریخ، تصورِ زندگی، تصورِ انسان، تصورِ قانون، تصورِ معیشت اور ایک مخصوص تجزیہ اور تنظیم نو کا نقشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس اور لینن اس سوشلزم سے برأت کا اعلان کرتے ہیں، جو ۱۸ ویں صدی سے ۲۰ ویں صدی تک یورپ میں مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوا۔ مارکس کی تصنیف Das Kapital[سرمایہ] محض معاشیات کے موضوع پر ایک کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ تاریخ اور خصوصیت سے صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ نظام پر ایک ایسی نقد و جرح (Critique) ہے، جو طبقاتی تصادم (Class conflict) کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ پیپلز پارٹی کے منشور میں سوشلزم اور اسلام کو جمع کرنے کی کوشش ضرور کی گئی تھی، مگر جہاں تک دستورِ پاکستان کا تعلق ہے، وہ مارکسزم کے فلسفے اور اس کے سیاسی و معاشی نظام سے دُور دُور تک کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ پیپلز پارٹی میں بھی بات صرف سوشلزم کی تھی۔ پیپلز پارٹی نے جو منشور دیا، اس کے چار ستون تھے جن کی نشان دہی ہر دستاویز میں کر دی گئی تھی، اور وہ یہ ہیں:

- اسلام ہمارا دین ہے
- جمہوریت ہماری سیاست ہے
- سوشلزم ہماری معیشت ہے
- طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

۱۹۷۰ء کے منشور کا دوسرا پیرا گراف ہی یہ اعلان کرتا ہے کہ:

> پارٹی پروگرام کی روح اور تفصیلات اسلام کی تعلیمات کا تقاضا کرتی ہیں اور سرگرمیاں اُس کے مطابق ہوتی ہیں۔ پارٹی اسلام اور قرآن کے خلاف کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ پارٹی کی تجاویز: عقیدے میں درج احکامات کے اصول اور روح سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اسلام میں مسلمانوں کے اندر جو مساوات بیان کی گئی ہے، وہ صرف ایک ایسے معاشی اور سماجی ڈھانچے میں ممکن ہے، جو اسے حاصل کرنے

کے لیے روبہ عمل لایا گیا ہو۔ (پیپلز پارٹی کا منشور ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء، پی پی پی سرکاری مطبوعات، ۲۰۰۹ء)

اس منشور میں استحصال (Exploitation) سے پاک معاشرے کی بات ہوئی ہے، لیکن مارکس اور لینن کے تصور کے مطابق نہیں بلکہ اسلام کے اصولوں کے طور پر۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پارٹی کے خیالات میں جھول اور تضادات تھے جن کے تحت وہ سوشلزم کو ایک محدود معنی میں لے رہی تھی حالانکہ وہ ایک مکمل نظام زندگی کا دعویٰ رکھتا تھا۔ نیز اسلام کے کچھ تصورات کی تشریح کے باب میں بھی اس کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا تھا اور ہم نے کیا۔ لیکن منشور کے ان واضح اعلانات کے علی الرغم یہ کہنا کہ دستور سازی کے عمل میں شریک بڑی جماعت پیپلز پارٹی مارکسزم اور لینن ازم کی علم بردار تھی اور اس نے دستور میں روس کے نظام کے تصورات کو ٹھونس دیا ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔

اسلام اور سوشلزم کو خلط ملط کرنے اور متضاد اور متصادم تصورات کے امتزاج سے ایک ملغوبہ بنانے کے باب میں اگر تنقید کا ہدف اس وقت کی اکثریتی جماعت پیپلز پارٹی کا ۱۹۷۰ء کا منشور ہوتا تو اس میں صداقت ہوتی۔ واضح رہے کہ ۱۹۷۷ء میں اسی پارٹی کے منشور کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس پارٹی کی قیادت خود سوشلزم کے معروف تصور سے جان چھڑانے اور اسلام کے سہارے سے تعبیرات کرنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے۔ پھر ۱۹۷۳ء کے دستور کے متن میں ایسے تضادات کے اجتماع کا دعویٰ حقیقت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، اور ایک معتبر عدالتی فیصلے میں ایسے دعویٰ کا آنا اور اس کو چیلنج نہ کیا جانا علمی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے بڑے خسارے کا معاملہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تعبیر کی اس غلطی کی اصلاح ضروری سمجھتے ہیں۔

محترم جسٹس صاحب کے پورے فیصلے میں جس ایک بات کو دستور کو سوشلسٹ نظریئے سے ہم آہنگ کرنے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ: "دستور کی دفعہ ۳

میں استحصال اور تقسیم دولت کا جو تصور دیا گیا ہے، وہ اس وقت کی سوویت یونین کے دستور کی دفعہ ۱۲ سے ماخوذ ہے گویا یہ ایک مماثلت، دستور کو سوشلسٹ رنگ میں رنگنے کے لیے کافی ہے"۔ دستورِ پاکستان کی دفعہ ۳ میں ہے:

> ریاست استحصال کی تمام قسموں کے خاتمے کو یقینی بنائے گی اور بتدریج اِس بنیادی اصول کی تکمیل کرے گی کہ ہر ایک سے اُس کی صلاحیت کے مطابق لیا جائے اور ہر ایک کو اُس کے کام کے مطابق دیا جائے۔

سوویت روس کے اُس وقت کے دستور کی دفعہ ۱۲ میں درج تھا:

> سوویت یونین میں کام ایک فرض ہے اور ہر مناسب جسامت کے مالک شہری کے لیے عزت کی بات ہے۔ اس اصول کے مطابق جو کام نہیں کرتا وہ کھائے بھی نہیں۔ سوویت یونین میں سوشلزم کے اس اصول پر عمل ہوتا ہے کہ ہر ایک سے اُس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جائے اور کام کے مطابق دیا جائے۔

پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ سوویت یونین کے دستور کی دفعہ ۱۲ میں جو بات کہی گئی ہے، وہ اس سے پہلے کی ۱۱ دفعات سے مربوط ہے۔ جس میں سوشلسٹ اسٹیٹ کا پورا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور پرولتاریہ کی آمریت اور اس کے لیے جن اداروں اور ریاست کی جس نوعیت کی تنظیم درکار ہے، اس کے خدوخال پیش کیے گئے ہیں۔ پیداوار کے پورے نظام کو سرکاری ملکیت میں لینا اور کمیونسٹ پارٹی کے ذریعے سیاسی اور معاشی عمل کو نئی بنیادوں پر مرتب کرنے کا نقشہ دیا گیا ہے۔ اس انتظامی اور تنظیمی ڈھانچے اور ملکیت کے نظام کی تبدیلی کے بغیر سوشلسٹ معیشت کا قیام ممکن نہیں۔ پاکستان کے دستور میں ان چیزوں کا دُور دُور کوئی وجود نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر روسی دستور کی دفعہ ۱۲ پر تنقیدی نظر ڈالی جائے، تو اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں بدترین استحصالی دروبست کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے،

اس میں اور اس دفعہ میں بیان کردہ ضابطے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

'کام اور محنت' کا ایک ذمہ داری ہونا، ہر نظام کا حصہ ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں بھی تو یہی ہوتا ہے کہ جو کام نہ کرے وہ بھوکا مرے! اس میں سوشلزم نے کون سا تیر مار لیا؟ ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق محنت اور اس کی کارکردگی کے مطابق اُجرت، اس سے کس کو اختلاف ہوگا؟ سرمایہ دار بھی کم از کم نظری طور پر یہی کہتا ہے: ''ہر کام کرنے والے کو اس کی کارکردگی اور صلاحیت کے مطابق اُجرت دی جائے''۔ مارکس کے نظریۂ محنت میں اسے چیلنج کیا گیا کہ محنت کا ایک حصہ سرمایہ دار لے اُڑتا ہے اور مزدور محروم رہتا ہے۔ عدل پر مبنی ہر نظام میں محنت کار کو اس کی کارکردگی اور صلاحیت کے مطابق اُجرت ملنی چاہیے۔ اس اصول کے تعین میں سوشلزم کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ مارکس کے افکار کے مطالعے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سرمایہ داری کے نظامِ استحصال سے نکلنے کے لیے وسائل پیداوار کو قومی ملکیت میں لے کر تقسیمِ دولت کے جو اصول بتائے، اس کے دو مراحل بیان کیے تھے: درمیانی (Transitional) دور میں یہ اصول ہوگا: ''ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے گا اور محنت کا اجر کارکردگی کے مطابق ہوگا''۔

لیکن جب اشتراکیت طبقات سے پاک معاشرہ بنائے گی تو پھر اصل سوشلزم کا اصول آئے گا جس میں: ''کام صلاحیت کے مطابق لیا جائے گا، اور اُجرت ضرورت کے مطابق دی جائے گی''۔ یہ ہے اشتراکیت یا مارکسزم کا اعلان کردہ موقف۔

ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک دوسرے پسِ منظر میں دستورِ پاکستان کی دفعہ ۳ میں ایک بے ضرر سے جملے کے شامل کیے جانے سے پورا قصرِ کریملین کیسے تعمیر کیا جاسکتا ہے؟ ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ مارکس نے استحصال کا ایک خاص تصور پیش کیا ہے۔ لیکن ہر اخلاقی اور مصنفانہ نظام میں استحصال ایک جرم ہے اور اس سے معاشرے کو پاک کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ پاکستان کے دستور میں استحصال کی کسی خاص شکل کا ذکر نہیں۔

محترم جج صاحب نے ایک مقام پر شکایتاً ایک بڑی معقول تنبیہ ''قراردادِ مقاصد میں زیادہ معنی نکالنے کی ترغیب'' (ص ۵۳۸) کے بارے میں کی ہے۔ بلاشبہ یہ علمی دیانت کا تقاضا ہے اور اس تنبیہ کا اطلاق نہ صرف 'قراردادِ مقاصد' پر ہوتا ہے بلکہ خود دستورِ پاکستان پر بھی۔ ہماری کوشش ہونا چاہیے کہ جو اس میں ہے اسے من و عن پیش کر دیں، نہ کچھ چیزوں کو دیکھنے سے انکار کریں اور نہ وہ کچھ ان میں بڑھا ڈالیں جن کا کوئی وجود نہیں۔ استحصال کی ہر قسم کا ذکر ہے اور یہ وہ تصور ہے جو خود اسلام نے پیش کیا ہے۔ قرآن صاف الفاظ میں متنبہ کرتا ہے کہ:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۱۸۸ۧ (البقرۃ ۲:۱۸۸)

اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض سے پیش کرو کہ تمھیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔

مزید ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ۝۱۸۱ۚ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ۝۱۸۲ۚ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝۱۸۳ۚ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ۝۱۸۴ۭ (الشعراء ۲۶:۱۸۱-۱۸۴)

پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمھیں اور گذشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔

واضح کیا گیا کہ امانت کی پاس داری اور خیانت سے اجتناب ہی دین حق کا راستہ ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۲۷ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝۲۸ۧ (الانفال

(۸: ۲۷-۲۸)

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔

اسلام نے ظلم اور استحصال کی ہر شکل سے اجتناب کا حکم دیا ہے اور ہر حق دار کا حق ادا کرنا اہلِ ایمان پر فرض کیا ہے۔ مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا حق اور پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اُجرت ادا کر دینے کا حکم دیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی معاشرے اور حکومت پر ڈالی ہے کہ کمزوروں کے لیے سہارا بنیں، ناداروں کی مدد کریں، قرض دار کو قرض سے نجات دلانے میں معاونت کریں، غریب اور مستحق کی مالی معاونت کریں اور معاشرے میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہے جو بلالحاظ مذہب و نسل و رنگ، بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو۔ اس حکم کا کوئی تعلق اشتراکیت سے نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کے اخلاقی، سماجی، معاشی اور دینی نظام کا بنیادی اصول ہے، جس کی پاس داری ہر مسلمان فرد اور مسلمان حکومت کے لیے ضروری ہے۔ 'قراردادِ مقاصد' کے تقاضوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتبِ فکر کے چوٹی کے ۳۱ علما نے اسلامی مملکت کے نظم کے حوالہ سے جو ۲۲ نکات مرتب کیے، ان میں یہ تین دفعات بھی شامل تھیں:

- مملکت بلاامتیاز مذہب و نسل وغیرہ، تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات، یعنی لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہو گی، جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعی اکتساب پر قادر نہ ہوں۔ (دفعہ ۶)
- باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں، یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیِ مذہب و مسلک، آزادیِ

عبادت، آزادیِ ذات، آزادیِ اظہار رائے، آزادیِ نقل و حرکت، آزادیِ اجتماع، آزادیِ اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادے کا حق۔(دفعہ ۷)

- غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب اور عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی، اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔(دفعہ ۱۰)

یہ ہے اسلام کا مطلوبہ نظام جس کے قیام کا تصور 'قراردادِ مقاصد' نے دیا ہے۔ اس کی موجودگی میں مسلمان اُمت کو دوسرے نظریات سے خوشہ چینی کی کیا ضرورت ہے۔

ہم پورے ادب سے عرض کریں گے پاکستان پیپلز پارٹی نے ۱۹۷۰ء میں سوشلزم کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہو، جہاں تک ۱۹۷۳ء کے دستور کا تعلق ہے، اس پر سوشلزم کی پرچھائیں تک نہیں پڑی۔ ہم پیپلز پارٹی سے اپنے تمام اختلافات کے باوجود اسے اس الزام سے بری سمجھتے ہیں اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں دو مزید شہادتیں پیش کرنا چاہتے ہیں، یعنی خود جناب ذوالفقار علی بھٹو کی وہ تقریر جو انھوں نے دستور کے مسودے کی آخری سماعت اور دستور کی منظوری کے موقعے پر کی اور جس میں دستور کے بنیادی ڈھانچے کو انھوں نے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا۔ اس پوری تقریر میں سوشلزم یا اس کے کسی جزوی پہلو کا بھی کہیں دُور دُور ذکر نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ۲۵ سال کے بعد بہت سارے اعتراضات اور جھگڑوں کے بعد ہم ایک ایسے نکتے پر پہنچ چکے ہیں، جہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ایک بنیادی قانون ہے، ہمارا ایک دستور ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت کی کسی بھی تعریف کے مطابق یہ ایک جمہوری دستور ہے .... کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ایک اسلامی

دستور ہے۔اس میں پاکستان کے کسی بھی ماضی کے دستور سے زیادہ اور مسلمان ملکوں کے علاوہ بادشاہتوں پر مبنی ممالک کے کسی بھی دستور سے زیادہ اسلامی دفعات ہیں۔اگر آپ بادشاہتوں پر مبنی ممالک سے اس کا موازنہ کریں تو اس میں پاکستان کے کسی بھی سابقہ دستور سے زیادہ اسلامی دفعات ہیں۔(قومی اسمبلی کی رُوداد، ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۲۴۶۸)

اسی تقریر میں آگے چل کر کہتے ہیں:

چنانچہ میرے دوستو! یہ دستور جو جمہوری ہے، جو وفاقی ہے، جس میں اسلامی نظام کی اہم خصوصیات شامل ہیں، اور اسلامی معاشرے کو تحفظ دیتا ہے، اور عدلیہ کو آزادی فراہم کرتا ہے، یہ دستور شہریوں کے بنیادی حقوق فراہم کرتا ہے۔(ایضاً، ص ۲۴۶۹)

اور اپیل کی کہ اس دستور کو پورے قلبی اطمینان کے ساتھ اور مکمل اتفاق رائے سے منظور کیجیے، خصوصیت سے تمام اپوزیشن جماعتوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا:

اب میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ایوان میں واپس آگئے ہیں ایک قدم آگے بڑھانے کے لیے، تاکہ اپنی حاضری کو منطقی انجام تک پہنچائیں اور ہمارے ساتھ پاکستان کے عوام کو ایک ایسا دستور دیں جو ایک متفق علیہ دستور ہو۔(ایضاً، ص ۲۴۶۹)

اور پھر اسمبلی نے مکمل اتفاق رائے سے دستور کو منظور کیا اور حزبِ اختلاف کے ایک قائد مولانا مفتی محمود صاحب سے دعائے شکرانہ کرواکر اسمبلی کی کارروائی ختم کی۔

۱۹۷۳ء کا دستور ایک متفقہ قومی دستاویز ہے، کسی ایک پارٹی کے خیالات کا عکاس نہیں۔اس دستور کا بنیادی ڈھانچا جن اصولوں پر مشتمل ہے، وہ پانچ ہیں:

* اسلام
* جمہوریت

* وفاق اور تقسیمِ اختیارات * بنیادی حقوق کا تحفظ

* عدلیہ کی آزادی

گو بات واضح ہو گئی ہے، لیکن صرف اتمامِ حجت کے لیے ہم ایک شہادت اور پیش کر دیتے ہیں اور یہ ہے پیپلز پارٹی کا ۱۹۷۷ء کا منشور، جس میں وہ ۱۹۷۳ء کے دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اپنے ایک کارنامے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن دیکھیے کہ دستور کی جن چیزوں کی داد طلب کر رہے ہیں، وہ یہ ہیں:

> پیپلز پارٹی نے ایک ایسے دستور کا وعدہ کیا تھا جو اسلامی، جمہوری، پارلیمانی اور وفاقی طرزِ حکومت کا آئینہ دار ہو۔ ہم نے یہ عہد پورا کر دیا ہے۔
>
> ۱۲۔ اپریل ۱۹۷۳ء کو پاکستان کا پہلا دستور عوام کے ان نمائندوں نے متفقہ طور پر منظور کیا جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست منتخب ہوئے تھے اور ۱۴۔ اگست ۱۹۷۳ء سے نافذ العمل ہوا۔ (پاکستان پیپلز پارٹی، منشور، ۱۹۷۷ء، ص ۴۶)

اس منشور میں جو بھٹو صاحب کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا، سوشلزم کا ذکر تو صرف ایک دو بار سرسری طور پر وہ بھی اس صراحت کے ساتھ کہ وہ اسلام کے مقدس اور ابدی اصولوں کے مطابق ہو گا، لیکن اسلام کے بارے میں شروع ہی میں بڑے مؤثر انداز میں اپنی خدمات کا ذکر کیا:

> پیپلز پارٹی نے اپنے منشور کے آغاز ہی میں یہ اعلان کیا کہ: اسلام ہمارا عقیدہ ہے۔ ہم نے آغاز ہی میں عہد کیا کہ ہمارا پروگرام اسلام کی روح اور احکامات کے مطابق ہو گا۔ گذشتہ پانچ سال میں پیپلز پارٹی کی پالیسیاں ہمارے اسی عہد پر مبنی تھیں اور اسلام کی عظمت و شان کے لیے ایسے جذبے سے نافذ کی گئیں، جس کا کوئی مقابلہ کسی سابقہ حکومت سے نہیں ہو سکتا۔
>
> پہلی دفعہ دستور کی دفعات میں اسلامی نظریۂ حیات ایمان داری سے شامل کیا گیا

ہے۔ اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا ہے۔ ہم نے دستور میں اپنا یہ عہد رقم کر دیا ہے کہ ہم قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کریں گے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے ٹھوس اقدامات اُٹھائے ہیں:

- ۹۰ سالہ قادیانی مسئلہ، دستور میں یہ اعلان کر کے کہ جو شخص محمدؐ کی ختم نبوت کو تسلیم نہیں کرتا مسلمان نہیں ہے، حل کر دیا۔
- فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں مسلم ریاستوں اور حکومتوں کے سربراہوں کی سربراہ کانفرنس منعقد کی۔
- اعلان کیا کہ جولائی ۷۷ء سے اتوار کے بجائے ہفتہ وار تعطیل جمعہ کی ہوگی۔
- پہلی بار سیرت کانفرنس منعقد کی اور مسجد نبویؐ کے اماموں کے دوروں کا اہتمام کیا۔
- حاجیوں پر سابقہ حکومتوں کی لگائی ہوئی پابندیاں ختم کیں، جس سے تقریباً ۳لاکھ پاکستانیوں نے فریضۂ حج ادا کیا۔
- زکوٰۃ کے لیے منصوبہ بند پالیسی بنائی اور اختیار کی۔
- غلطیوں کے بغیر قرآنِ پاک کی طباعت کے لیے قوانین نافذ کیے۔
- جہیز اور شادی کے تحائف پر اسلام کی روح کے مطابق پابندی کا قانون نافذ کیا، جو عام آدمی کو شادی کے موقعے پر کمر توڑ اخراجات سے نجات دلاتا ہے۔
- ریڈ کراس کا نام ہلال احمر سوسائٹی کر دیا۔

محترم جج صاحب کے ارشادات کے سلسلے کے پہلے دو نکات پر ہم نے تفصیل سے گفتگو کر لی ہے۔ تیسرے نکتے[1] کے بارے میں ہم اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ ایک تاریخی

[1] تیسرا نکتہ: پاکستان کے قیام کی تحریک کا محرک نظریاتی تھا۔ اسلام قیام پاکستان کی اصل بنیاد ہے۔

حقیقت کا منصفانہ اعتراف ہے اور ہم اس پر انھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ البتہ چوتھے نکتے کے بارے میں صرف ریکارڈ درست کرنے کے لیے یہ عرض کریں گے کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم میں بلاشبہ اسلام اور سوشلزم دونوں کی صدائے بازگشت موجود تھی، لیکن اس میں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام متنازع نہیں تھا۔ اختلاف اسلام کے تصور اور تقاضوں کے ادراک کے باب میں تھا۔ پیپلز پارٹی کے منشور میں بھی اسلام سرفہرست تھا۔ مسلم لیگ کے تین دھڑے میدان میں تھے، مگر ہر ایک نے اسلام کو اپنی ترجیح کے طور پر بیان کیا تھا۔

جن جماعتوں کو دینی جماعتیں کہا جاتا ہے، ان کے پلیٹ فارم کا مرکزی نکتہ اسلام اور اس کا نظامِ حیات ہی تھا۔ اس لیے پیپلز پارٹی اور دوسری جماعتوں کے موازنے میں ان کے تصورِ اسلام کے بارے میں اختلافات اور ترجیحات کے نظام میں فرق کی بات تو معقول اور مناسب ہے، لیکن پاکستان میں اسلام کے کردار کو نزاع کا باعث کہنا حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ رہا معاملہ اسمبلی میں نشستوں اور عوامی مقبولیت کا، تو اس بارے میں عمومی رائے کو ایک دوسرے تصور کے مطابق پیش کرنا مناسب نہیں ہے۔

بلاشبہ اسمبلی میں پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کو اکثریت حاصل تھی مگر یہ سب سیاسی بساط کے روایتی کھیل کا حصہ ہے کیونکہ اس وقت کے صوبہ سرحد [خیبر پختونخوا] اور بلوچستان میں جمعیت علماے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی [NAP] شریکِ اقتدار تھے اور صوبہ سرحد کی حکومت مفتی محمود صاحب کی وزارتِ اعلیٰ میں نیشنل عوامی پارٹی کی تائید اور شمولیت سے وجود میں آئی تھی۔ دستور سازی کے باب میں نظریاتی پہلو اور سیاسی گروہ بندی میں اگر فرق رکھا جائے تو حالات کو سمجھنے میں سہولت ہو گی۔

اُوپر کی گزارشات کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دستور کی یہ تعبیر کہ وہ اسلام اور سوشلزم کا ایک مرکب ہے، قطعاً اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اور اگر یہ مفروضہ درست نہیں تو پھر اس غبارے سے بھی ساری ہوا نکل جاتی ہے کہ ان دو متضاد رجحانات کی موجودگی کی وجہ سے دستور میں کسی بنیادی ڈھانچے کی تلاش لاحاصل مشق ہے۔

دستور کا ایک واضح ڈھانچا، اس کی مستحکم واضح بنیاد اور اساسی اصول موجود ہیں اور دستور کی تعبیر میں ان کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اور رہے گی۔

خلاصۂ بحث

آخر میں ہم بحث کا خلاصہ ان نکات میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ 'قراردادِ مقاصد' ایک مستقل بالذات دستوری دستاویز ہے، جو تحریکِ پاکستان کے مقاصد اور اہداف کی ترجمان اور پاکستان کی منزلِ مقصود کی آئینہ دار ہے۔ یہ قرارداد ہی دستور کی بنیاد اور اس کے بنیادی ڈھانچے کی اصل صورت گر ہے۔

۲۔ دستورِ پاکستان اس قرارداد کی روشنی میں مرتب اور مدون کیا گیا ہے۔ ریاست پاکستان جس اصول پر قائم ہے، وہ یہ ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور پاکستانی قوم حدوداللہ کی مکمل پاس داری کے عہد وپیمان کے ساتھ قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کو اپنا مقصدِ وجود سمجھتی ہے، اور دستور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک فریم ورک کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ اس دستور کی بنیاد اور اس کے ناقابلِ تغیر پہلو کم از کم پانچ ہیں، یعنی: * اس کا اسلامی کردار اور شناخت۔ * جمہوری طرزِ حکومت جس میں قانون کی بالادستی اور عوام کی مرضی کے مطابق ان کی فلاح و بہبود اور ان کے اخلاقی، نظریاتی، تہذیبی، معاشی عزائم اور توقعات کی تکمیل کو اولیں حیثیت حاصل ہے۔ * بنیادی حقوق کا تحفظ اور اسلام کے اصولِ حکمرانی اور حقوق و فرائض کے نظام کا مکمل احترام ایک بنیادی قدر ہے، جس پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا جاسکتا۔ * پاکستان کا نظام وفاقی ہے جس میں مرکز اور وفاق کی اکائیوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا مکمل احترام اور وسائل کے طے شدہ اصولوں اور شرائط کی روشنی میں استعمال کا اہتمام ضروری ہے۔ * عدلیہ کی آزادی اور خودمختاری، جو انصاف کی فراہمی کے ساتھ دستور کے تحفظ اور بنیادی

حقوق کی پاس داری کی نگرانی کے نظام کی آخری ذمہ دار ہے۔ یہ دستور کا بنیادی ڈھانچا ہے، جس کی پاس داری مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ اور عوام سب کی ذمہ داری ہے۔

۴۔ قرآن و سنت کی بالادستی اور اسلام کے اصولوں کی روشنی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر و ترقی اصل ہدف اور منزل ہے۔

۵۔ اخلاقی اقدار کو ہمارے نظام میں مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہیے، تاکہ قوم و ملک کی ترقی کا وہ نقشہ حقیقت کا رُوپ دھار سکے، جس میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو، انسانوں کے درمیان حقیقی مساوات قائم ہو، اور اللہ کی زمین فساد سے پاک اور خیر اور فلاح کا گہوارا بن سکے۔

۶۔ عوام کی اخلاقی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی ترقی ہمارا مقصود ہے اور اس عمل میں عوام ہی کا کردار سب سے اہم ہے۔ ہر سطح پر عوام کو اختیارات کی منتقلی اور ان اختیارات کے مناسب استعمال کے مواقع کی فراہمی، ریاست اور اس کے تمام اداروں کی ترجیح اور ریاستی وسائل کے استعمال کا مقصد و محور ہونا چاہیے۔

۷۔ حقوقِ انسانی کا تحفظ، قانون کی حکمرانی، اختیارات کی تقسیم اور توازن، خاندانی نظام کی تقویت اور معاشرے میں امن، برداشت، مشاورت، تعاون باہمی کا فروغ اور اچھی حکمرانی کامیابی کا معیار اور میزان ہوں۔

۸۔ دستور پر اس کے الفاظ اور روح کے مطابق عمل اور افراد کی اصلاح کے ساتھ اداروں کا استحکام اصل ترجیح ہو۔

۹۔ آزادی اور قومی سلامتی کے تحفظ کے ساتھ ایک حقیقی جمہوری، فلاحی اور استحصال سے پاک معاشرے کا قیام اور معاشرے کے تمام طبقات کو ترقی کے مساوی مواقع کی فراہمی کا اہتمام ہو۔

۱۰۔ اقلیتوں کا تحفظ اور ان کے لیے ایسے مواقع کی فراہمی کہ وہ اپنے مذہب اور ثقافت کے

دائرے میں رہتے ہوئے قومی زندگی کی تعمیر اور ترقی میں بھرپور کردار ادا کرسکیں۔

یہ وہ اہداف ہیں جو 'قراردادِ مقاصد' اور دستور کے قومی پالیسی کے خطوطِ کار کا تقاضا ہیں اور یہی وہ میزان اور کسوٹی ہے جس پر حکومت، سیاسی جماعتوں اور قومی اداروں کی کامیابی یا ناکامی کو جانچا جانا چاہیے۔

(نومبر ۲۰۱۵ء)

حصہ دوم

پاکستان میں نفاذِ شریعت کی کوششیں

① نفاذِ شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ء

② نفاذ شریعت ایکٹ پر اعتراضات: ایک علمی محاکمہ

③ سوات اور مالاکنڈ میں شرعی نظامِ عدل کا نفاذ

نفاذِ شریعت ایکٹ (۱۹۹۱ء)

۱۹۷۳ء کے دستور کا پاکستان کی پارلیمنٹ سے متفقہ طور پر منظور ہونا ملکی استحکام کی جانب اہم قدم تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں نفاذِ شریعت ایکٹ کی پارلیمنٹ سے منظوری نفاذِ شریعت کی جدوجہد میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم اس قانون میں موجود بہت سے نقائص کی بناء پر ایک طرف تو دین پسند حلقوں کے ذہن میں اس کی افادیت سے متعلق بہت سے سوالات تھے، دوسری طرف نفاذِ شریعت کے مخالفین نے اس کے بارے میں گمراہ کن پراپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا۔ زیرِ نظر مضمون میں اس ایکٹ کی منظوری کے پراسیس اور اس کی اہم دفعات کا دیانتدارانہ علمی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے بل کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۹۹۰ء میں سینیٹ سے پاس کردہ شریعت بل سے اس قانون کا موازنہ کیا ہے۔ اس موازنہ میں دونوں دستاویزات کے تقابل سے بتایا گیا ہے کہ ان میں کس حد تک مطابقت یا اختلاف پایا جاتا ہے۔

ایکٹ کے بارے میں چند بنیادی سوالات

نفاذِ شریعت بل قومی اسمبلی اور سینیٹ میں منظور ہونے اور صدرِ مملکت کی توثیق کے بعد اب ''نفاذِ شریعت ایکٹ'' بن چکا ہے، اور اس طرح پاکستان میں پہلی بار اسلامی شریعت کو کم سے کم اس کی کتابِ قانون میں ملک کا بالاتر قانون تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ملک میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔ اس لیے بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شریعت ایکٹ وہی چیز ہے جو اس جدوجہد کا کم سے کم مطلوب تھا یا ہو سکتا تھا؟ کیا اس ایکٹ سے وہ اجتماعی اور تاریخی عمل شروع ہو سکتا ہے، یا ہو جائے گا، جو پاکستان کو اس کے اصل نصب العین، اور ایک مسلمان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے منتہیٰ، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول ﷺ کی ہدایت کے مطابق معاشرہ کی تشکیل، اللہ تعالیٰ کے قانون کی فرماں روائی، اس کے دین کے قیام، اس کے کلمہ کی سربلندی، یا اسلامی نظام کے قیام کی طرف کم سے کم وقت میں رواں دواں کر سکے؟

یہ سوال ان سب لوگوں کے لیے انتہائی اہم ہے جو قیام پاکستان کے وقت سے ہی نفاذِ شریعت کے لیے کوشاں ہیں، اور جن کی کاوشیں مسلسل اس ہدف پر مرکوز رہی ہیں۔ اس ایکٹ سے کیا حاصل ہوا، کیا حاصل نہیں ہو سکا؟ کیا پایا، کیا کھویا؟ قدم آگے بڑھے ہیں، یا اور پیچھے چلے گئے ہیں؟ امید کی شمع روشن ہوئی ہے، یا آرزوؤں کا دیا بجھ گیا ہے؟ جدوجہد کسی نقطۂ اختتام پر پہنچ گئی ہے، یا اسے اسی طرح جاری رہنا ہے جس طرح پہلے تھی؟ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا گیا ہے، یا کم سے کم اس کی طرف ایک قدم آگے بڑھا دیا گیا ہے، یا قوم کو صرف چند خوبصورت الفاظ اور وعدہ پر ٹرخا دیا گیا ہے؟ ان کی بات تو جانے دیجیے جو سرے سے شریعت کا نفاذ ہی نہیں چاہتے، یا اس کے مخالف ہیں، وہ لوگ جو دل سے شریعت کے نفاذ کے آرزو مند ہیں، ان کے ذہنوں میں بھی شریعت ایکٹ کے بارے میں شکوک وشبہات ہیں، اور اس قسم کے سوالات مسلسل گردش کر رہے ہیں۔ مختلف دینی حلقوں کی طرف سے اس ضمن میں متفرق بلکہ بعض دفعہ متضاد آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اس لیے ذیل میں شریعت ایکٹ کا بے لاگ جائزہ لے کر دیکھا گیا ہے کہ اس سے کیا حاصل ہوا اور کیا نہیں ہو سکا؟ اس میں کیا خوبیاں ہیں، اور کیا خامیاں۔

شریعت کی بالادستی کا مطلوبہ تصور کیا ہے؟

مسلمان صرف اسی وقت صحیح معنوں میں مسلمان ہو سکتا ہے جب وہ اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق گزارنے کے لیے تیار ہو، اور اس راہ میں مسلسل کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ شریعت اسی کا جواب ہے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں جو ہدایت واحکام دیے گئے ہیں وہی اللہ تعالیٰ کی مرضی کا مظہر ہیں اور شریعت انھی

احکام پر مشتمل ہے، یا ان سے مستنبط احکام پر۔ اسی لیے شریعت اور شریعت کا نفاذ ہر مسلمان کے دل کی آرزو اور اس کا نصب العین رہی ہے، اور ہے۔

اس لحاظ سے شریعت کا دائرہ پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ شریعت میں انسان کی نیت اور ارادہ بھی شامل ہے، اس کی عبادت اور مراسمِ عبادات بھی۔ گویا اس کا ظاہر بھی، اور اس کا باطن بھی۔ اس کے اخلاق بھی اور اس کے آداب بھی۔ اس کی پرائیویٹ لائف بھی، اور اس کی پبلک لائف بھی۔ اس کا سیاسی ڈھانچہ بھی اور اس کی خاندانی زندگی بھی۔ اس طرح شریعت کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو دستور و قانون، ریاستی قواعد و ضوابط، حکومتی و ریاستی امور اور پبلک پالیسی کے تحت نہیں آتا، لیکن ایک بڑا حصہ وہ بھی ہے جو اسی دائرہ کے تحت آتا ہے۔ دستور اور قانون کے ذریعہ جب بھی شریعت نافذ کرنے کا کام ہو گا تو وہ انسانی زندگی کے اسی بہت بڑے حصے ہی سے تعرّض کرے گا۔

دستور و قانون کے ذریعہ پبلک لائف کے دائرہ میں نفاذِ شریعت کے لیے سب سے زیادہ ضروری بلکہ بالکل ناگزیر امر یہ ہے کہ شریعت ہر لحاظ سے ملک کا بالاتر قانون ہو۔ قانون کے دائرہ میں ہر قانون کے مقابلے میں، تمام ریاستی و حکومتی امور و احکام اور قواعد و ضوابط کے مقابلے میں، ہر رسم و رواج کے مقابلے میں، حتّٰی کہ خود دستور کی ہر دفعہ کے مقابلہ میں قرآن و سنت کو اور شریعت کو بالادستی حاصل ہو۔

کیا ایکٹ کو ایک اہم پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے؟

شریعت ایکٹ کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ پاکستان کی ۴۳ سالہ تاریخ میں یہ وہ پہلی قانونی دستاویز ہے جس میں شریعت کو ملک کا بالاترین قانون قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ یہ ایک بہت اہم پیش رفت ہے اور اس ایکٹ کے ذریعہ سے اگر حکومتی ذمہ دار اور عدالتیں چاہیں اور اس قانون کا نفاذ خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ کریں تو نفاذِ شریعت کے لیے بے شمار دروازے کھولے جا سکتے ہیں، اور اس راہ پر بہت آگے جایا جا سکتا ہے۔

کیاایکٹ قرآن وسنت کی بالادستی کی ضمانت ہے؟

لیکن کیا محض شریعت ایکٹ میں قرآن وسنت کو بالاترین قانون قرار دیاجانا،اوراس انداز میں قرار دیا جانا جس انداز میں قرار دیا گیا ہے، ریاست اور قانون کے دائرہ میں ان کی بالاتری قائم کرنے کے لیے کافی ہے؟ جو شخص بھی قانون اور دستور کے فرق سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ ملک کا بالاترین قانون دستور ہوتا ہے،اور پارلیمنٹ کا منظور کردہ کوئی قانون دستور سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ دستور میں اگر قرآن وسنت کے خلاف کسی قانون یا ضابطہ کو تحفظ دیا گیا ہے، تو شریعت ایکٹ کے باوجود اس قانون یا ضابطہ کو تحفظ حاصل رہے گا اور وہ قرآن وسنت سے بالاتر ہی رہے گا ۔اگر دستور کاروبارِ مملکت کے کسی حصہ کو قرآن وسنت کی بالاتری کے دائرہ سے باہر رکھتا ہے، تو شریعت ایکٹ کے باوجود وہ حصہ قرآن وسنت کی بالاتری کے دائرہ سے باہر ہی رہے گا۔ اسی طرح اگر خود دستور کی کوئی دفعہ قرآن وسنت کے خلاف ہے، تو شریعت ایکٹ کے باوجود وہ دفعہ نافذ العمل رہے گی۔ اسی طرح شریعت ایکٹ کے تحت قائم کردہ قرآن وسنت کی بالاتری کسی طرح بھی دستور کے کسی حصہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کے دستور میں ایسے حصے موجود ہیں جو یا تو خود قرآن وسنت کے خلاف ہیں، یا ان معنوں میں قرآن وسنت کے خلاف ہیں کہ وہ بعض قوانین، بعض حکومتی اختیارات اور ماضی کے بعض اقدامات کو شریعت کے دائرہ سے باہر رکھتے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں ان کو قرآن وسنت سے بالاتر رکھتے ہیں۔ نہ صرف قرآن وسنت سے بالاتر رکھتے ہیں، بلکہ اس پارلیمنٹ اور ان بنیادی حقوق سے بھی بالا رکھتے ہیں، جن کی دہائی ہر اس مرحلہ پر دی جاتی ہے جب نفاذِ شریعت کا نام لیا جاتا ہے،اور کہا جاتا ہے کہ شریعت کے نفاذ سے پارلیمنٹ کی بالادستی ختم ہو جائے گی،اس کا حق قانون سازی عدالتوں کو منتقل ہو جائے گا اور بنیادی حقوق خطرے میں پڑے جائیں گے۔ حالانکہ دستور کے یہ حصے اور تحفظات تو پہلے ہی بنیادی حقوق کو پامال کر رہے ہیں،اور پارلیمنٹ کی بالادستی اور حقِ قانون سازی پر قدغن اور پابندی لگاتے ہیں۔

دستور کی دفعات میں سے قرآن وسنت کے خلاف دفعات کی ایک واضح مثال وہ

دفعات ہیں جو صدرِ ریاست، وزیر اعظم، وزراء، حکومتی افسران اور ان کے اقدامات کو عدالتی محاسبہ سے بالاتر قرار دیتی ہیں، اسلام کے نظام انصاف کا یہ اصول بالکل بنیادی ہے کہ تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں۔ حاکم و محکوم کے درمیان تفریق دور غلامی کی میراث ہے جس کو ہر دستور ساز اپنے مفاد میں تحفظ دیتا ہے۔

جن قوانین واقدامات کو دستور میں قرآن وسنت کے دائرہ سے باہر رکھا گیا ہے۔ گویا ان کو قرآن وسنت سے بالاتر رکھا گیا ہے، ان کی واضح مثالیں مسلم فیملی لاز آرڈیننس، عدالتی طریق کار کے قوانین اور مارشل لاء حکومتوں کے بے جا اقدامات وغیرہ ہیں۔ مسلم فیملی لاز آرڈ ینس ایوب خان صاحب کے دور میں مارشل لاء کے بل پر نافذ کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد ہر آنے والے حکمران نے جو مارشل لاء کے بل پر ہی آیا اس کو عدالتی چارہ جوئی کے خلاف تحفظ عطا کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا غیر اسلامی دور اور ان کا ۱۹۷۳ء کا دستور ہو، یا جنرل ضیاء مرحوم کا اسلامائزیشن کا دور اور ان کا ۱۹۸۵ء کا دستور فیملی لاء آرڈی نینس کو ہر ایک نے قرآن وسنت سے بالاتر قانون ہی رکھا۔ نہ صرف قرآن وسنت سے بلکہ بنیادی حقوق اور پارلیمنٹ سے بھی بالاتر۔ اسی طرح جس نے بھی مارشل لاء لگایا اور جائز و ناجائز اقدامات کیے خواہ وہ ایوب خان ہوں، بھٹو صاحب ہوں یا جنرل ضیاالحق ہر ایک نے اپنے اقدامات کو ایسا جواز و تحفظ فراہم کیا کہ نہ قرآن وسنت ان کو غیر مؤثر کریں، نہ بنیادی حقوق، نہ دستور کی کوئی اور دفعہ، نہ کوئی عدالتی کارروائی۔

دستور و قانون کے فرق کو اور ہمارے دور کے ان خلاف قرآن وسنت پہلوؤں کو ذہن میں رکھا جائے تو شریعت ایکٹ کے خلاف یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ اس کے ذریعے موجودہ سیاسی ڈھانچے، عدالتی نظام یا فیملی لاز آرڈ ننس کو شریعت کی بالاتری کے دائرہ سے باہر کر دیا گیا ہے۔ ان کو تو ۱۹۶۲ء سے آج تک ہر دستور نے مکمل تحفظ دیا ہے اور جس چیز کو دستور نے شریعت کے دائرہ سے باہر رکھا ہو، پارلیمنٹ کے کسی قانون کے بس میں یہ نہ تھا کہ اس کو شریعت کے دائرہ میں داخل کر دیتا۔ اگر جنرل ضیاء الحق نے بھی فیملی لاز آرڈیننس، عدالتی

نظام اور دس سال کے لیے مالی امور کو دستور کے تحت قرآن وسنت کی بالاتری کے دائرہ سے باہر رکھا ہو، یا رکھنے پر مجبور رہے ہوں اور ان کے نافذ کردہ شریعت آرڈیننس نے بھی ان کو اس دائرہ میں داخل نہ کیا ہو، یا نہ کر سکا ہو، تو آج کی یہ پارلیمنٹ صرف شریعت ایکٹ کے ذریعہ یہ کارنامہ کسی طرح سرانجام دے سکتی تھی۔

یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ ہر قانون کے مقابلے میں، ہر حکومتی ضابطے اور قاعدے کے مقابلے میں، ہر پالیسی کے مقابلے میں، ہر حکومتی اقدام کے مقابلے میں، حتٰی کہ خود دستور کی ہر دفعہ کے مقابلے میں، قانوناً قرآن وسنت کی بالاتری اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس امر کو اسی طرح دستوری ترمیم کے ذریعے خود دستور میں رقم نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ شریعت ایکٹ خود اپنی جگہ شریعت کی بالاتری قائم کرنے کے لیے ناکافی ہے۔

جس نے بھی اور جب بھی دستوری و قانونی ذرائع سے شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ کیا اس کے لیے کوشش کی، وہ کبھی بھی اس بنیادی حقیقت سے غافل نہ تھا۔ حتٰی کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد چار نکاتی مطالبہ اسلامی نظام کی مہم ہو یا اسلامی دستور کی جدوجہد، اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران ۱۹۷۳ء کے دستور میں تبدیلی کے لیے آٹھویں اور نویں ترمیمی بل ہوں یا بعد ازاں سینیٹ میں شریعت کا بل، یہ ادراک ہمیشہ رہا کہ شریعت کے نفاذ کے لیے قرآن وسنت کو ملک کا بالاترین قانون ہونا چاہیے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب خود ملک کا دستور اس بالاتری کو تسلیم کرے اور غیر مشروط طور پر کرے۔ جس طرح ایک فرد صحیح معنوں میں اسی وقت مسلمان ہو سکتا ہے۔ جب وہ کلمہ کو زبان سے ادا کرے اور قلب سے اس کی تصدیق کرے، اسی طرح ریاست صحیح معنوں میں اسی وقت تابع شریعت ہو سکتی ہے، جب وہ کلمہ کے ان مقتضیات کو دستور میں درج کر دے اور صدقِ دل سے ان کو تسلیم کر کے ان پر عمل کے لیے کوشاں ہو جائے۔

حتٰی کہ شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ء کو پیش کرنے اور منظور کرانے والے بھی یہ بات خوب اچھی طرح جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دستوری ترمیم کے بغیر نفاذِ شریعت کا کام مکمل اور

مستحکم نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ ادراک بھی رکھتے تھے کہ نفاذِ شریعت ایک ہمہ گیر عمل کا نام ہے جو محض ایک قانون منظور کر دینے یا دستور میں ترمیم کر دینے سے بھی عبارت نہیں۔ بلا شبہ یہ قانون اور یہ ترمیم وسیع تر عمل کا ایک اہم حصہ ہے لیکن اس کے پورے نتائج صرف اس وقت سامنے آ سکتے ہیں جب ایک ایسا پورا پیکیج نافذ کیا جائے جو ایک طرف کاروبارِ مملکت کے تمام اہم حصوں پر محیط ہو، دوسری طرف معاشرہ کی پوری زندگی پر اثرانداز ہو۔

چنانچہ وزیرِ اعظم پاکستان جناب نواز شریف نے جب ۲۴ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ (۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء) کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں قوم کے سامنے نفاذِ شریعت کے عہد کا اعادہ کیا، تو انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اگلے ہی دن ترمیم دستور بل بھی پیش کیا جائے گا جو قرآن و سنت کو ملک کا بالاترین قانون قرار دے گا۔ اگر یہ ترمیم دستور بل پیش ہو جاتا اور اسے اسی انہماک اور لگن سے پاس کرایا جاتا جس طرح کچھ دن بعد بارھواں دستوری ترمیم کا بل (سنگین جرائم کے مقدمات کے لیے خصوصی عدالتوں کے قیام کا بل) پاس کرایا گیا، تو قانونی طور پر نفاذِ شریعت کا کام مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جاتا۔ لیکن ادھر جناب وزیرِ اعظم قوم سے یہ وعدہ کر کے عمرہ پر تشریف لے گئے، ادھر دستوری ترمیم کا بل اس طرح غائب ہو گیا جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔ نہ وہ ترمیمی بل پیش ہوا، نہ اس کے پیش نہ ہونے کی کوئی وجہ بیان کی گئی، نہ قوم سے اس وعدہ خلافی کی کوئی معذرت کی گئی، نہ بعد میں شریعت ایکٹ کی منظوری کے پورے دور میں کبھی اس کا ذکر کا گیا، حتیٰ کہ جب بارھویں ترمیمی بل کے لیے زور و شور سے مہم چلائی گئی اور قوم سے خطاب کیا گیا، اس وقت بھی دستور کی یہ ترمیم یاد نہ آئی۔ گویا جہاں تک دستور میں قرآن و سنت کی بالاتری تسلیم کرنے کا وعدہ اور اعلان کا تعلق تھا وہ نظرانداز کر دیا گیا۔

کیا دستوری ترمیم کے بغیر شریعت کی بالادستی کی ضمانت ہو سکتی ہے؟

بلاشبہ شریعت ایکٹ جیسا کہ منظور ہوا ہے، اس میں کئی مثبت اور خوش آئند پہلو ہیں اور اس میں کئی نمایاں خامیاں بھی ہیں۔ حقیقتاً اگر صدق دلی سے یہ کام سرانجام دیا جاتا تو یہ ایکٹ بھی اس سے کہیں زیادہ بہتر صورت میں آ سکتا تھا، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس ایکٹ کو کتنا ہی بہتر بنا لیا جاتا، دستور میں ہر چیز کے مقابلے میں، اور کسی بھی چیز کے علی الرّغم قرآن و سنت کی بالاتری تسلیم کیے جانے کے بغیر ہر نقش خام ہوتا اور ہر کوشش ناتمام۔

آج شریعت ایکٹ کی جو خامیاں ہدف تنقید ہیں، ان کا علاج شریعت ایکٹ میں نہیں تھا بلکہ دستوری ترمیمی بل میں ہے۔ اور وسیع تر پیکیج (Package) کے نفاذ میں ہے جو جناب وزیراعظم کے پاس موجود اور تیار ہے اور جس کے نفاذ کا وہ اعلان کر چکے ہیں۔

ہم بجا طور پر یہ امید رکھتے ہیں کہ جناب وزیراعظم اور ان کی حکومت ضروری دستوری ترمیمی بل، معاون قوانین اور دوسری انتظامی اصلاحات کے نفاذ کے بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گی۔ یہ ان کا عہد اور وعدہ ہے جو انھوں نے نہ صرف انتخابات کے دوران بڑے بڑے عوامی جلسوں میں بہانگ دُہل کیا ہے۔ بار بار کیا ہے، اس کی بنیاد پر ووٹ مانگے ہیں اور کامیاب ہوئے ہیں، بلکہ رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اللہ کے گھر میں حاضری کے لیے جاتے وقت ملک کی نمائندہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں بھی کیا ہے، وہ اس وعدہ کی عدمِ تکمیل کی صورت میں اپنے خدا، اپنی قوم اور اپنے ضمیر، تینوں کے سامنے مجرم ٹھہریں گے۔

شریعت کی بالادستی کے لیے کی جانے والی جدوجہد ایک نظر میں

تمنائیں اور دعائیں اپنی جگہ، لیکن کیا ماضی کے حقیقت پسندانہ جائزہ سے یہ امید بندھ سکتی ہے کہ دستور میں ترمیم کا وعدہ پورا ہوگا اور نفاذِ شریعت کا کام واقعتاً کسی راستہ پر لگ جائے گا؟

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے جب ۱۹۴۸ء میں چار نکاتی مطالبہ نظامِ اسلامی[1] پیش کیا، تو اس کا اہم ترین نکتہ یہی تھا کہ قرآن و سنت کو بالا تر حیثیت حاصل ہو۔ قرآن وسنت کی بالاتری کے معنی تو موجودہ جاہلی نظام پر ایک ضربِ کاری ہے۔ چنانچہ خوشنما الفاظ میں قرار دادِ مقاصد پاس ہو گئی، اس سے بھی زیادہ خوشنما الفاظ میں اسمبلی میں اس کا قصیدہ پڑھا گیا۔ لیکن اس قرار دادِ مقاصد سے قرآن و سنت کی بالا تر حیثیت کے متعلق نکتہ غائب تھا اور قرار دادِ مقاصد جس شکل میں پاس ہوئی۔ اس شکل میں بھی اس کو اتنا خطرناک سمجھا گیا کہ اس کو دستور کا واجب التنفیذ حصہ بنانے کے بجائے دیباچہ بنا کر آویزاں کر دیا گیا۔ اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ قرار دادِ مقاصد ایک بے معنی چیز تھی۔ نہیں، تمام خامیوں کے باجود یہ ایک اہم سنگِ میل تھا۔ اس نے ہمیشہ کے لیے ریاست کا رخ متعین کر دیا، اور پاکستان کو اسلام کے کھونٹے سے باندھ دیا گیا۔ اسلامی دستور کے لیے جدوجہد ایک طویل عرصہ تک جاری رہی، لیکن جو کچھ حاصل ہوا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کی وہ ساری تعلیمات جو واجب التنفیذ ہونا چاہیے تھیں، وہ رہنما اصولوں کے طور پر دستور کے شروع میں سجادی گئیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات دستور میں تسلیم کر لی گئی کہ کوئی قانون بھی قرآن و سنت کے خلاف نہ بنایا جائے گا، لیکن اس کے نفاذ کے لیے بھی کوئی طریقِ کار دستور میں شامل نہ کیا گیا۔ موجودہ قوانین کو

---

[1] دستور ساز اسمبلی سے سیّد مودودی کا چار نکاتی مطالبۂ نظامِ اسلامی۔ ۱۹۴۸ء: چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے۔ چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اس خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا اب قیامِ پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں منسوخ کیے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات اُن حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔

اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل جیسا غیر مؤثر ادارہ تجویز کیا گیا۔ اس کی رپورٹیں پارلیمنٹ کے آگے رکھنے تک کو لازم نہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ اگر کبھی اس کونسل نے سنجیدگی سے اپنا کام کیا اور اس کی ساری سفارشات "دریابُرد" نہ بھی کی جا سکیں تو "فائلنگ کے لیے الماری بُرد" ضرور کی جاتی رہیں۔

اس کے بعد ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء آیا۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم سب سے بڑھ کر اسلامائزیشن کے مدعی اور دُعا گو تھے۔ اور اس کا اعتراف ضروری ہے کہ جو کچھ کام انھوں نے کیا، اتنا کام بھی ان کے کسی پیش رو سے نہ بن پڑا تھا۔ قرار دادِ مقاصد کو دستور کے مستقل احکام کا حصہ بنایا۔ فیڈرل شریعت کورٹ قائم کی، جس نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، اگرچہ اس کے ججوں کی حیثیت صدر مملکت کے ملازمین کی رہی۔ نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ قائم کیا، حدود آرڈیننس نافذ کیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایک طرف تو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات سے ان کی الماریاں بھرتی رہیں، دوسری طرف دستور میں ترمیم کے لیے کھلے اختیارات رکھنے کے باوجود، اور ہر ایسی دستوری ترمیم کرنے اور کرانے کے باوجود، جس سے ان کی پوزیشن بحیثیت صدر مستحکم اور غالب ہوتی تھی، انھوں نے دستور میں وہ دو سطری ترمیم نہ کی جس سے قرآن و سنت کی پوزیشن بحیثیت قانون کے غالب اور مستحکم ہو جاتی۔

اس تاریخی پس منظر میں کیا ہمیں یہ امید رکھنا چاہیے کہ جناب وزیر اعظم قوم سے اپنا وعدہ پورا کریں گے اور دستوری ترمیمی بل کے ذریعے قرآن و سنت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دے دیا جائے گا؟ ہم اس سوال کا جواب اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں بس اتنا ضرور کہیں گے کہ شریعت ایکٹ میں ہزار خامیاں سہی، اس کو ان خامیوں کے لیے جن کا ازالہ اس ایکٹ کے دائرہ کار میں نہیں آتا، موردِ الزام قرار دینا انصاف سے بعید ہو گا۔

ایکٹ ۱۹۹۱ء کے چند مثبت پہلو

اسلامی نظام ریاست کے حق میں تجدیدِ عہد

شریعت ایکٹ صرف اس بنا پر ہی اہم نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ ایک بار پھر قوم اور اس کی پارلیمنٹ نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، قرآن و سنت کی بالادستی اور اسلام کے اجتماعی نظام کو عملاً قائم کرنے کے عہد کا اعادہ کیا ہے، بلکہ اس کے ذریعہ اس نظریاتی بحث کو بھی ایک بار پھر اسلامی نظامِ ریاست کے حق میں طے کر دیا گیا ہے، جسے کچھ حلقوں نے گزشتہ دس بارہ سال میں بڑی ہوا دی تھی اور جس کے سہارے پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانے کے لیے عالم گیر مہم چلائی گئی۔ اس مہم کے دوران بڑی ہی دیدہ دلیری کے ساتھ اسلام اور اس کے قانون کو مارشل لاء اور فوجی آمریت سے خلط ملط کیا گیا۔ اسلام کے بارے میں گمراہ کن پراپیگنڈہ (Disinformation) کی یہ مہم ملک میں بھی چلائی گئی اور بیرون ملک بھی، اور اس سلسلہ میں جھوٹ اور غلط بیانی کے جھکڑ تک چلائے گئے۔ مثلاً یہ کہ ''شریعت آئے گی تو پارلیمنٹ بے حیثیت ہو کر رہ جائے گی''۔ بنیادی حقوق پر کاری ضرب لگے گی۔ ''عورتوں کے حقوق چھن جائیں گے ''۔'' غیر مسلم تو دوسرے درجے کے شہری ہو کر رہ جائیں گے ''۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ''جمہوری نظام دفن ہو جائے گا''۔ ''شریعت کی آواز مارشل لاء کی پیداوار ہے، آمریت کا تحفہ ہے۔ عوام قطعاً اس کے ساتھ نہیں''۔

نفاذِ شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ء ملک کی پارلیمنٹ نے کھلی بحث کے بعد عظیم اکثریت سے منظور کیا ہے اور اس طرح جمہوری عمل کے ذریعہ شریعت کا نفاذ جیسا کچھ، اور جتنا کچھ ہوا ہے۔ پارلیمنٹ نے شریعت ایکٹ پاس کر کے اس وعدہ کو پورا کرنے کی طرف ایک قدم بڑھایا ہے جو اسلامی جمہوری اتحاد نے قومی انتخابات کے موقع پر عوام سے کیا تھا اور جس پر عمل کرنے کا واضح مینڈیٹ عوام نے اکتوبر ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں ان کو دیا تھا۔ اصولاً جمہوری عمل کے ذریعہ شریعت کے نفاذ کی جانب پیش رفت کتنی ہی خام کیوں نہ ہو ایک خوش آئند عمل ہے۔

اور اس بات کی نفی کرتی ہے کہ شریعت اور جمہوریت یا ملکی معاملات میں عامتہ المسلمین کی بالادستی کے درمیان کوئی تناقض ہے۔

مقننہ اور عدالت کے ذریعے نفاذ شریعت کے امکانات

سماجی تبدیلی کے لیے دو موثر قانونی طریقے آج دنیا میں معروف ہیں یعنی:

۱۔ پارلیمنٹ کے ذریعہ قانون سازی۔

۲۔ عدالتوں کے ذریعہ قانون کی تنفیذ۔

شریعت ایکٹ کے بعد ان دونوں طریقوں کا بیک وقت نفاذِ شریعت کے لیے متحرک ہونے کا راستہ کھل گیا۔

شریعت ایکٹ میں قرآن و سنت کی قانونی بالادستی قائم کر دی گئی ہے۔ اگرچہ یہ بالادستی دراصل دستوری تحدیدات کی پابند ہے جن کا ازالہ دستوری ترمیم کے بغیر ممکن نہیں، لیکن ان تحدیدات کے دائرہ میں اب احکامِ شریعت کے قیام کے لیے تدوینِ قانون (Codification of Law) کا انتظار ضروری نہیں رہا۔ بلکہ شریعت کے ان احکام کی روشنی میں بھی جو قانونی طور پر ملک میں پارلیمنٹ کے ذریعہ نافذ نہیں ہوئے ہیں، عدالتیں قانونی معاملات پر غور کر سکیں گی اور تصادم و تضاد کی صورت میں ملکی قانون کے اس حصہ کو ختم کر سکیں گی۔ جو شریعت کے خلاف ہے۔

شریعت ایکٹ کی ضرورت ہی اس بنا پر پڑی کہ پارلیمنٹ اور صوبائی حکومتیں گزشتہ ۲۳ سال میں ملک کے قانون کا شریعت کی روشنی میں جائزہ نہیں لے سکیں اور اسلامی قانون کو مدوّن کرنے کی طرف کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں کر سکیں۔ اب اس قانون کے نتیجہ میں ایک طرف پارلیمنٹ کے لیے اسلامی قانون کی تدوین کا کام ضروری ہو جائے گا اور اس طرح پارلیمنٹ جس تعطل کا شکار رہی ہے، اس کے ٹوٹنے کا امکان ہے۔ اور دوسری طرف اس قانون کا یہ بھی حاصل ہے کہ عدالتیں شریعت کے قانون کو خواہ وہ غیر مدوّن ہی کیوں نہ ہو، زیر غور

لا سکیں گی اور اپنے فیصلے کرنے میں ملک کے دستور اور قانون کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کے احکام پر بھی غور کرنے کی پابند ہوں گی۔ اگرچہ ملک کے دستور پر اوران معاملات پر جن کو خود دستور نے باہر کر دیا ہے، قرآن و سنت کی روشنی میں غور واحتساب تواب بھی ان کے دائرہ سے باہر ہو گا تاہم باقی معاملات میں عدالتیں شریعت کے احکام کو پیش نظر رکھنے کی پابند ہوں گی۔ بلاشبہ جن معاملات میں ملکی قانون اور شریعت میں تصادم ہو گا ان میں قانون کے جائز و ناجائز ہونے پر دستور کے مطابق غور ہو گا۔ البتہ جن معاملات میں عدالت ماضی میں صرف رسم و رواج یا قانونِ فطرت کے مطابق فیصلہ کرتی تھی، اب ان میں وہ سب سے پہلے شریعت سے رجوع کرے گی اور شریعت کے مطابق ہی فیصلہ کرے گی۔ اسی طرح تعبیرِ قانون میں بھی قانون کی اس تعبیر کو ترجیح دے گی جو شریعت کے مطابق ہو۔

شریعت ایکٹ کی وجہ سے شریعت کے نفاذ کے یہ دونوں راستے متحرک ہو سکتے ہیں، اور پارلیمنٹ اور عدالت دونوں کے لیے شریعت کے احکام سے رجوع ضروری ہو جائے گا، نیز نفاذ شریعت کے سلسلے میں گزشتہ دس گیارہ سالوں میں فیڈرل شریعت کورٹ اور دوسری اعلیٰ عدالتوں نے جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اب اور زیادہ مؤثر ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

شریعت کی جامع اور متفق علیہ تعریف

شریعت ایکٹ کا ایک اور پہلو جو خصوصی غور و فکر کا متقاضی ہے، شریعت کی تعریف کے متعلق ہے۔ ہم فخر محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں عالم اسلام میں پاکستان کا کردار بڑا ہی نمایاں اور منفرد ہے۔ مسلم ممالک کے دساتیر کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن ممالک نے اسلام کو قانون سازی میں کوئی حصہ دیا ہے انہوں نے بھی اس کام کو مخصوص فقہی تحدیدات کا پابند کر دیا ہے۔

سعودی عرب کی حیثیت منفرد ہے کہ تحریری دستور نہ ہوتے ہوئے بھی ایک سرکاری فرمان کے ذریعے قرآن پاک کو ملک کا دستور قرار دیا گیا ہے۔ گو عملاً قانونی اور عدالتی

فیصلے حنبلی مسلک کی روشنی میں ہوتے ہیں لیکن بطورِ ماخذ صرف قرآن وسنت کا ذکر کیا گیا ہے۔ افغانستان میں موجودہ صورتحال سے قبل فقہ حنفی کو ملک کا رائج الوقت قانون تسلیم کیا گیا تھا۔ ایران میں صرف جعفری فقہ کو قانون کا درجہ حاصل ہے اور صرف جعفری فقہ کے ماہرین اس مجلس کے رکن بن سکتے ہیں جو دینی معاملات میں پارلیمنٹ کی رہنمائی کرتی ہے۔ مصر، یمن اور متعدد دوسرے ممالک میں بھی کسی ایک فقہ کو شرفِ قبولیت بخشا گیا ہے۔

پاکستان کے دستور میں شروع ہی سے صرف قرآن و سنت کو قانون کا ماخذ مانا گیا۔ احوالِ شخصیہّ کے لیے ہر فقہی مسلک کو اپنے مسلک کے مطابق شخصی قانون پر عمل کی اجازت ہے لیکن ملک کے پبلک لاء کو کسی ایک فقہ کا پابند نہیں کیا گیا۔ شریعت بل میں، جیسا کہ وہ سینٹ میں پیش ہوا تھا، گو کسی فقہ کا ذکر نہ تھا مگر شریعت کی تعبیر و تشریح کے باب میں ایسی اصطلاحات استعمال ہوئی تھیں جن پر ایک خاص فقہ کے علماء نے اعتراض کیا۔ یہ ایک تابناک حقیقت ہے کہ اس ملک کے علماء، خصوصاً حنفی علماء اور خود شریعت بل کے محرّکین نے بڑی وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے جس آخری شکل میں شریعت کی تعریف کو قبول کیا وہ پوری امت کی وحدت اور نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایکٹ کی دفعہ ۲ میں کہا گیا ہے کہ:

''شریعت سے اسلام کے احکام مراد ہیں جس طرح کہ وہ قرآن پاک اور سنت میں منضبط کیے گئے ہیں''۔

تشریح: ''شریعت کی تفسیر اور تعبیر کرتے ہوئے قرآن پاک اور سنت کی تفسیر و تعبیر کے مسلمہ اصولوں کی پابندی کی جائے گی اور اس کے [لیے] ان مسلمہ فقہاء کی تشریحات اور آراء کا لحاظ رکھا جائے گا جن کا تعلق مروجہ اسلامی فقہ کے مکاتب فکر سے ہو''۔

اس تعریف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ متفق علیہ ہے۔ اس پر ملک کے تمام مکاتب فکر و فقہ کا اتفاق ہے۔ تحریکِ نفاذ فقہ جعفریہ کے نمائندوں کے اصرار پر اس میں

"مروجہ اسلامی فقہ کے مکاتب فکر" کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس طرح الحمد للہ تمام سنی مکاتب فکر اور اہل تشیع دونوں نے اس تعریف پر اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ ملی وحدت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس اتفاق رائے کو پیدا کرنے میں آٹھ دینی جماعتوں کے فورم نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس تعریف کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

۱۔ قرآن وسنت کو اصل مرجع تسلیم کیا گیا ہے۔
۲۔ تمام فقہی مکاتب فکر کے مستند فقہاء کی آراء سے استفادہ کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔
۳۔ تعبیر وتفسیر میں تعبیر وتشریح کے مسلمہ اصول وضوابط کی پابندی کی شرط مانی گئی ہے جس سے آزاد روی کے اس دروازے کو بند کر دیا گیا ہے، جس کے ذریعہ تجدد کے علمبردار مغرب پرست طبقے اسلام کا حلیہ بگاڑنے کا کام کرتے رہے ہیں اور قادیانیت، نیچریت، پرویزیت جیسے نت نئے فتنے ابھرتے رہے ہیں۔
۴۔ شریعت کے اصولوں کے مطابق نئے حالات کا مقابلہ کرنے اور نئے مسائل حل کرنے کے لیے اجتہاد اور اجماع کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔

یہ وہ متوازن فارمولا ہے جس پر عمل کر کے آج کے حالات میں مسلمان ایک طرف قرآن وسنت سے وفاداری کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں تو دوسری طرف نئے حالات کا مقابلہ کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کر سکتے ہیں۔

پورے معاشرے کی اصلاح اور تشکیلِ نو

شریعت ایکٹ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا دائرہ اسلامی قانون کی عدلیہ کے ذریعہ تنفیذ تک محدود نہیں، بلکہ پورے معاشرہ کی اسلامی تشکیل نو کو اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ جس تصور کو اس میں اجاگر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حصول انصاف ہی شریعت کا مقصد ہے اور منصفانہ معاشرہ کا قیام دراصل وہ میزان ہے جس پر ایک معاشرہ کے اسلامی یا غیر اسلامی

ہونے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اسلام فرد کی آزادی اور حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ایک منصفانہ اور عادلانہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس کے لیے تعلیم، ابلاغ عامہ، معیشت، انتظامیہ، پولیس اور عدلیہ سب کی اصلاح ضروری ہے۔ اس طرح نفاذِ شریعت ایکٹ ایک روایتی قانون سے زیادہ وسیع ہے۔ اسی لیے اس پر ایک 'منشور' ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اس طرح یہ نفاذِ شریعت کا جامع نقشہ پیش کرتا ہے اور حکومت کے تمام ہی اہم شعبوں کی اسلامی بنیادوں پر تنظیم نو کا ہدف قوم کے سامنے رکھتا ہے۔ اس کی حیثیت ان قوانین کی ہی نہیں جو کسی ایک مجرم اور اس کی سزا سے متعلق ہوں بلکہ ان قوانین کی سی ہے جو معاشرتی پالیسی کی بنیادیں رکھتے ہیں اور اسی طرح قانون کی زبان میں اصلاح احوال کا ایک وسیع نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اس کی مثال برطانوی پارلیمنٹ کے ان قوانین جیسی ہے جو تعلیم کی اصلاح اور تشکیل جدید کے لیے ۱۹۴۶ء اور پھر ۱۹۸۸ء میں منظور کیے گئے تھے۔ آخرالذکر قانون تقریباً ۲۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور نظام تعلیم اور تعلیمی پالیسی کا مکمل نقشہ پیش کرتا ہے شریعت ایکٹ بھی اسی نوعیت کے اصلاحی قوانین کی قبیل سے ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اصلاح کا پروگرام پیش کرتا ہے جس پر عمل کرنے کے لیے متعدد نئے قوانین منظور کرنے ہوں گے اور بے شمار انتظامی اصلاحات درکار ہوں گی۔

سینیٹ کے پاس کردہ بل ۱۹۹۰ء سے موازنہ

نکاتِ اتفاق

ضروری ہے کہ شریعت ایکٹ کا موازنہ اس شریعت بل سے کیا جائے جو سینیٹ نے ۱۹۹۰ء میں منظور کیا تھا۔ اس موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ (۸) امور ایسے ہیں جن میں اصل اور جوہر کے اعتبار سے ان دونوں میں یکسانی اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ جب کہ پانچ (۵) پہلو ایسے ہیں جن میں نمایاں فرق اور اختلاف ہے۔ اس تجزیہ میں ان دونوں پہلوؤں کو بھی

سامنے رکھنا ضروری ہے۔

نفاذِ شریعت ایکٹ نہ اس آرڈ نینس کا چربہ ہے جو جنرل ضیاء الحق کی جانب سے مئی ۱۹۸۸ء میں نافذ کیا گیا تھا اور نہ اس شریعت بل کا مثنیٰ ہے جو سینیٹ نے منظور کیا تھا۔ یہ کئی پہلوؤں سے اپنی جگہ ایک نیا قانون ہے۔ اس کی خوبیاں اور کمزوریاں دونوں خود اپنی ہیں۔ البتہ چونکہ ان تینوں کا مقصد اور ہدف ایک ہی تھا، اس لیے اس ایکٹ کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو سمجھنے میں اس موازنہ سے مدد ملے گی۔ ہم اس موازنہ میں الفاظ اور تفصیل کے مقابلہ میں مسائل کی حقیقت اور جوہر کو ملحوظ رکھیں گے۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ جب سینٹ نے شریعت بل متفقہ طور پر منظور کیا تھا اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ اسلامی جمہوری اتحاد نے زور و شور سے مطالبہ کیا تھا کہ اس بل کو من وعن قومی اسمبلی بھی پاس کر دے خود آج کے وزیر اعظم اس مطالبے میں پیش پیش تھے۔ یہ امر آج تک ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ جس بل کو سینیٹ نے متفقہ طور پر پاس کیا جہاں اسلامی جمہوری اتحاد کی اکثریت تھی۔ جس بل کے لیے اسلامی جمہوری اتحاد نے پیپلز پارٹی سے زور شور سے مطالبہ کیا کہ وہ اس بل کو نافذ کر دے، جس بل کو نافذ کرنے کے لیے انتخابات میں عوام سے مینڈیٹ لیا گیا، اسی بل کو اتحاد نے اقتدار سنبھالتے ہی کیوں پسِ پشت ڈال دیا؟

ہماری نگاہ میں جن چیزوں میں بڑی حد تک شریعت ایکٹ اور سینیٹ کے شریعت بل میں یکسانی اور مطابقت پائی جاتی ہے وہ یہ ہیں:

ا۔ شریعت کی تعریف اور تشریح: جزوی فرق کے ساتھ ایکٹ میں وہی تعریف دی گئی ہے جو سینیٹ والے شریعت بل میں پیش کی گئی تھی، اس فرق کے ساتھ کہ سینیٹ والے بل میں یہ بات اجمالی طور پر آئی تھی کہ تمام فقہاء کی آراء سے استفادہ کیا جائے گا۔ جب کہ نفاذِ شریعت ایکٹ میں اس بات کو بالکل کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ تمام مروجہ مکاتب فکر کے مسلمہ

فقہاء کی آراء سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس طرح یہ تعریف تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ کے رہنماؤں کے لیے بھی قابل قبول بن گئی۔

۲۔ قوانین میں تطبیق کے اصول: سینیٹ والے شریعت بل میں قوانین میں تطبیق کے جو اصول پیش کیے گئے تھے۔ نفاذِ شریعت ایکٹ میں ان کو بھی بالکل اسی طرح قبول کر لیا گیا ہے۔

۳۔ قرآن وسنت کی بالادستی: سینیٹ کے منظور کردہ بل میں کہا گیا تھا کہ شریعت پاکستان کا بالا تر قانون ہوگی اور ہر قانون، رسم ورواج اور ضابطہ کے علی الرّغم نافذ ہوگی۔ شریعت ایکٹ میں اس اصول کو تسلیم تو کر لیا گیا ہے اور شریعت کو بالا تر قانون بھی قرار دیا گیا ہے۔ البتہ سینیٹ بل میں جو بات شریعت بل کی تعریف میں علیٰحدہ دفعہ میں واضح طور پر کی گئی تھی، اسے شریعت ایکٹ میں مختصراً شامل کر لیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ''شریعت''یعنی احکام اسلام، جس طرح کہ قرآن پاک اور سنت نبویؐ میں منضبط کیے گئے ہیں، پاکستان کا اعلیٰ ترین قانون ہوں گے۔ ''قانون اور رسم ورواج کے علی الرّغم'' والا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ بالا تر قانون کی اصطلاح اس مقصد کو حاصل تو کر لیتی ہے کہ شریعت دوسرے قوانین اور رسم ورواج پر بالادستی رکھے گی مگر جس ماحول میں اور جس قسم کے افراد کے ذریعہ نفاذ شریعت کا کام ہوتا ہے، اس کے پیش نظر یہ حذف بنفسہ بھی خوش آئند نہیں، کیوں کہ اس کا غلط استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ شریعت کے ماخذ اور شرعی عُلوم کی تعلیم: سینیٹ والے بل میں انہیں خصوصی اہمیت دی گئی تھی۔ اگرچہ شریعت، علوم اسلامی اور عربی زبان کی تعلیم کی اہمیت کو نفاذ شریعت ایکٹ میں بھی تسلیم کیا گیا ہے، مگر یہاں بھی غیر ضروری لفظی تغیرات کے کیے گئے ہیں۔ (مثلاً دفعہ ٦۔الف، ب، ج)

اس اصول کو تسلیم تو کیا گیا کہ ملک کے عدالتی نظام میں ان افراد سے استفادہ کا دروازہ کھولا جائے گا، جو دینی علم میں مہارت رکھتے ہیں اور جن کو افتاء کا مناسب تجربہ ہے اور سینیٹ

والے بل میں اس پہلو کو بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا تھا۔ مگر شریعت ایکٹ میں تمام تفاصیل کو نکال دیا گیا ہے اور ان کو قواعد و ضوابط مرتب کرتے وقت تک کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ مملکت اس امر کا مناسب انتظام کرے گی کہ عدالتی نظام میں شریعت، اسلامی اصول، قانون اور افتاء میں باقاعدہ سند یافتہ اشخاص کی خدمات سے استفادہ ہو سکے (مثلاً دفعہ ۔۶ 'د')۔ تفاصیل کا حذف اور ان کو قواعد وضوابط کے لیے چھوڑ دینا جو پارلیمنٹ پاس نہ کرے گی گویا چور دروازے کھولنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۵۔ نظام تعلیم کی اصلاح کی ضرورت اور اس کے لیے کمیشن کا قیام: یہ دفعہ تقریباً انہی الفاظ میں ہے جو سینٹ والے بل میں تھی۔

۶۔ نظام معیشت کی اسلامی تشکیلِ نو: یہ دفعہ بھی تقریباً انہی الفاظ میں ہے جو سینیٹ والے بل میں تھی۔ ربا کے خاتمہ کی ضرورت کو زیادہ مؤثر اور واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور کمیشن کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ اپنی سفارشات اور دوسری اسلامی اصلاحات پر عمل درآمد کا مسلسل جائزہ لے اور پارلیمنٹ کو اپنی رپورٹ پیش کرتا رہے۔ البتہ اس کام کے لیے کسی مدت کا تعین نہیں کیا گیا۔

۷۔ ذرائع ابلاغ کی اصلاح: اس موضوع پر بھی جوہری اعتبار سے سینیٹ کے بل اور اس ایکٹ میں کوئی فرق نہیں البتہ تعلیمی کمیشن کے دائرہ کار میں پہلے ابلاغ عامہ کی نگرانی بھی بصراحت موجود تھی جو شریعت ایکٹ میں نہیں ہے۔

یہ وہ آٹھ پہلو ہیں جن میں دونوں مسوّدوں میں بڑی حد تک یکسانی اور مطابقت پائی جاتی ہے اگرچہ الفاظ اور اجمال و تفصیل کا اختلاف بھی بعض صورتوں میں کم اہم نہیں ہوتا۔

نکاتِ اختلاف (ایکٹ کی خامیاں)

شریعت ایکٹ جن پہلوؤں سے سینیٹ کے منظور کردہ بل سے مختلف ہے ان میں سے کچھ کا تعلق تو انداز بیان سے اور کچھ کا تفصیل کی جگہ اجمال سے ہے۔ گو ہم اجمالی پر تفصیل کو

ترجیح دیتے ہیں لیکن جن امور کو اجمالی اور اصولی طور تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہم ان کو باعث نزاع نہیں بنانا چاہتے۔ البتہ اپنے اس احساس کو ضرور ریکارڈ پر لے آنا چاہتے ہیں کہ بعض تفصیلات کے شاملِ ایکٹ ہو جانے سے اس ایکٹ کے نفاذ میں مدد ملتی۔ مزید براں یہ امر بھی تشویش اور اضطراب کا باعث ہے کہ ایک بات کو اصولی طور پر تسلیم کرنے کے بعد بھی اس کے متعدد مقتضیات کو یا تو کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا جاتا یا پھر انہیں قواعد وضوابط کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے جن کے بنانے میں حکومت کی انتظامیہ کو پورے اختیارات حاصل ہیں اور جن کو پارلیمنٹ میں زیر غور نہیں لایا جاتا۔ پھر بھی ہم ان جزوی اور رسمی اختلافات سے صرف نظر کرتے ہوئے ان بنیادی امور کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جن میں نفاذ شریعت ایکٹ سینیٹ کے منظور کردہ بل سے مختلف ہے اور ہماری نگاہ میں ان تمام پہلوؤں سے کمزور اور ناقص بھی ہے اور اصلاح طلب بھی۔

ا۔ واضح عدالتی طریق کار کا عدمِ تعین: شریعت ایکٹ کا ایک بنیادی ہدف یہ ہے کہ وہ نفاذِ شریعت کے لیے عدالتوں کو متحرک کردے۔ اس سلسلہ میں سینیٹ کے بل میں ایک واضح عدالتی طریق کار تجویز کیا گیا تھا جس میں اس بات کی رعایت رکھی گئی تھی کہ ماتحت عدالتوں پر مناسب تیاری سے پہلے ایک ذمہ داری نہ ڈالی جائے جس کے ادا کرنے میں ان کو دشواری پیش آئے۔ اسی طرح اعلیٰ عدالتوں کے بارے میں بھی دستور میں جو تحدیدات ہیں ان کو ملحوظ رکھ کر وفاقی شرعی عدالت اور عدالت عالیہ کے دائرہ ہائے اختیار (Jurisdiction) کا تعیّن کر دیا گیا تھا (دفعہ ۴)۔ یہ تمام چیزیں شریعت ایکٹ سے خارج کر دی گئی ہیں۔ ماہرین قانون ہم سے اتفاق کریں گے کہ شریعت کی بالادستی کی (دفعہ۔۳) کی شق ۲ کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان امور کو چھوڑ کر جن کا ذکر استثناء میں ہے باقی معاملات میں عدالتیں شریعت کی بالادستی کو قائم کرنے کا اختیار رکھتی ہیں۔ اور چونکہ دستور کی رو سے اعلیٰ عدالتوں کا اختیار دستور کے ساتھ ساتھ قانون کے ذریعہ بھی متعین کیا جا سکتا ہے، اس لیے عدالتوں کے اس نئے اختیار میں کوئی شبہ نہیں۔ البتہ اس دفعہ میں عدالتوں کے لیے طریق کار کے مسئلہ کو بالکل کھلا چھوڑ دیا گیا ہے

جو ہماری نگاہ میں اس بل کی ایک بہت بڑی خامی ہے۔ در حقیقت اتنے اہم قانون میں ایسا خلاء چھوڑنا ایک سانحہ ہے۔ ہم نے پہلے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ عدالتوں کے لیے طریق کار کو انہی خطوط پر مرتب ہونا چاہیے جو سینیٹ کے بل میں تجویز کیا گیا تھا۔ اس سے نفاذِ شریعت کا عمل آسان اور مؤثر ہو سکے گا اور عوامی دور میں نچلی سطح کی عدالتوں میں جس اختلاف یا انتشار کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے اس سے بچا جا سکے گا۔

۲۔ عُمّالِ حکومت اور انتظامیہ کی عدالتی جواب دہی کا غیر مؤثر طریق کار: دوسری بنیادی خامی اس ایکٹ کی یہ ہے کہ اس میں انتظامیہ کی عدالتی جواب دہی کے لیے کوئی مؤثر طریقِ کار فراہم نہیں کیا گیا ہے۔ محض یہ کہہ دینا کہ تمام مسلمان شہریوں کے لیے شریعت کی پابندی لازمی ہوگی اور انتظامیہ کے لیے ضابطہ اخلاق بنایا جائے گا، قطعاً غیر تسلی بخش ہے۔ اسلام کے نظام انصاف کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں اور جو جتنا زیادہ ذمہ داری کے مقام پر ہے اس کی جواب دہی بھی اتنی ہی زیادہ ہے۔ اس پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ تمام عُمّالِ حکومت خواہ ان کا تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو سول یا فوجی انتظامیہ، مقننہ یا عدلیہ، وفاق، صوبہ یا لوکل گورنمنٹ ان کے تمام اقدامات بھی اسی طرح عدالتی محاسبہ کے لیے کھلے ہوں۔ عام انسانوں کے جان مال اور آبرو کے تحفظ، معاشرہ کو ظلم و ناانصافی سے پاک کرنے اور خود بد عنوانیوں اور بے ضابطگیوں کو ختم کرنے کے لیے یہ انتظام بہت ضروری ہے۔ سینیٹ کے بل میں اس کے لیے دو مکمل دفعات تھیں یعنی دفعہ ۵ اور ۶ موجودہ شکل میں انتظامیہ پر احتساب کا نظام بہت کمزور اور حاکم اور محکوم کی اس تفریق کو تحفظ دینے والا ہے جو اِسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس لیے شریعت ایکٹ کی دفعہ ۵ پر بھی مکمل نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۳۔ سود کے خاتمہ کا خلافِ اسلام انتظام: تیسرے بنیادی مسئلہ کا تعلق سود اور اس کے خاتمہ سے ہے۔ نفاذ شریعت ایکٹ میں تین مقامات پر اس مسئلہ سے تعرّض کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی دفعہ ۸ میں کوئی بڑی خامی نہیں جس میں معیشت کو سود اور دوسرے منکرات سے پاک

کرنے اور اسلامی اصول و اقدار کی روشنی میں اس کی تشکیل نو کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے ایک مستقل کمیشن قائم کیا گیا ہے۔ کمیشن کی ذمہ داری ہے کہ ''مختصر ترین مدت میں معاشی سرگرمیوں کے ہر ایک شعبہ سے ربا کے خاتمہ کی نگرانی کرے، اور حکومت کو ایسے اقدامات کی سفارش کرے جو معیشت سے ربا کے مکمل خاتمہ کو یقینی بنائیں''۔ بلاشبہ یہاں اس کام کو مکمل کرنے کے لیے کوئی مدت متعیّن نہیں کی گئی اور پہلے جو تجویز تھی کہ یہ کام تین سال میں مکمل کیا جائے۔ اسے علماء کے اعتراض کے بعد حذف کر دیا گیا۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ پارلیمنٹ میں اور اس سے پہلے شریعت بل پر کام کرنے والی کمیٹی میں یہ بات کھل کر سامنے آئی تھی کہ ملک کے حکمرانوں کا ایک طبقہ سود کو مزید تحفظ دینا چاہتا ہے اور فیڈرل شریعت کورٹ کے اس اختیار کو واپس لینا چاہتا ہے جو مالی اور محصولاتی قوانین کے اس عدالت کے دائرہ میں آجانے سے اسے حاصل ہوا ہے۔ تمام دینی جماعتوں اور ان کے نمائندوں نے اس نوعیت کی تبدیلی کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اسے رجعت قہقری قرار دیا۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے تبدیلی کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں اور اب اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ حق فیڈرل شریعت کورٹ کو حاصل ہے جو اس نوعیت کی ۵۰ کے قریب درخواستوں کی سماعت کر رہی ہے۔ اب جو ادارہ مہلت دینے کا مجاز ہے وہ صرف فیڈرل شریعت کورٹ ہے۔ اسی وجہ سے کمیشن یا حکومت کے لیے کوئی زمانی قید عائد نہیں کی گئی اور مثبت طور پر ربا کے مکمل خاتمہ کو بطورِ ہدف رکھا گیا۔

خرابی جہاں سے رونما ہوتی ہے وہ ایکٹ کی دفعہ ۱۸ اور ۱۹ ہیں۔ دفعہ ۱۹ میں سودی قرضوں کے سلسلہ میں موجودہ ذمہ داریوں کی تکمیل کی ضمانت دی گئی ہے۔ یہ اس مثالی صورت حال سے مختلف ہے جس کی نظیر قرونِ اولیٰ میں مدینہ کی اسلامی ریاست میں فتح مکہ کے بعد ملتی ہے۔ لیکن خود سینیٹ کے منظور کردہ بل میں بھی دفعہ ۱۹ کے مفہوم کی ایک دفعہ موجود ہے۔ شریعت ایکٹ کی دفعہ ۱۸ سب سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ سینیٹ کے بل کی دفعہ ۱۵ میں پرانی ذمہ داریوں کے مسئلہ سے تعرض کیا گیا تھا مگر اس آخری حد تک گنجائش رکھ

لی گئی تھی جس کا کوئی جواز ہو سکتا تھا، یعنی ماضی کی تمام بین الاقوامی ذمہ داریوں کو ادا کیا جائے، ماضی میں کیے گئے معاہدات کی کوئی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ لیکن آئندہ کے لیے دروازہ بند کر دیا جائے۔ موجودہ ایکٹ میں آئندہ کے لیے بھی دروازہ کھلا رکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جب تک متبادل انتظام نہ ہو جائے سودی معاہدات اور ادائیگیوں کے سلسلہ پر پابندی نہیں ہو گی۔ یہ شریعت کے صریح خلاف ہے۔ اس گنجائش کو خود نفاذِ شریعت ایکٹ کے ایک حصہ کے طور پر رکھنا ایک ایسی جسارت ہے جس کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ تمام دینی جماعتوں نے اس پر تنقید کی ہے اور اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ سود کے مکمل خاتمہ کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے، فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ اختیار کو نہ صرف یہ کہ کم نہیں ہونے دیں گے بلکہ اس کو بڑھانے کے لیے کوشش کریں گے اور اس خامی کو دور کرنے کے لیے خود شریعت ایکٹ میں مناسب ترمیم کے لیے سعی کریں گے۔ ہماری نگاہ میں دفعہ ۱۸ میں ترمیم بہت ضروری ہے۔

۴۔ کتاب وسنت کی بالادستی کے منافی اور متصادم احکام کا تحفظ: شریعت ایکٹ کی چوتھی خامی کا تعلق ان تحفظات سے ہے جو اس میں مختلف امور کے بارے میں دیے گئے ہیں۔ یہ عجیب ذہنیت ہے کہ ایک طرف شریعت کے نفاذ اور قرآن وسنت کی بالاتری کی بات کی جاتی ہے اور دوسری طرف شریعت کے دائرہ سے مختلف امور کو باہر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ وہ روش ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بہت ناپسند کیا ہے اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی ہے بلکہ اسے شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (البقرۃ ۲:۲۰۸)
>
> اے ایمان لانے والو، تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرۃ:۸۵)

تو کیا تم اللہ کی کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

شریعت ایکٹ کی دفعہ ۳ میں یہ دو تحفظات ڈالے گئے ہیں۔ ایک ملک کے دستوری نظام اور سیاسی ڈھانچہ کے بارے میں اور دوسرا غیر مسلموں کے آئین میں دیے گئے حقوق کے سلسلہ میں۔ ویسے تو دستور عام قانون سے بالا تر ہوتا ہے اور کسی عام قانون کے ذریعہ دستور میں بیان کردہ کسی چیز کو نہ تو کالعدم کیا جا سکتا ہے اور نہ محدود۔ اس لیے یہ تحفظ تو بہر حال موجود تھا۔ مگر اس ایکٹ میں اس کے اظہار سے قلب ونظر کی بیماری کا پتہ چلتا ہے جو ہمارے اضطراب کا سبب ہے۔ اور عملی طور پر گناہ بے لذت کے مترادف ہے۔

اس طرح دفعہ ۲۱ کے ذریعہ غیر ضروری طور پر پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے حق قانون سازی کے بارے میں ایک بحث کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اگر دستور کے تحت کوئی حق کسی بھی ادارہ کو حاصل ہے تو وہ عام قاعدہ کے مطابق شریعت ایکٹ سے متاثر نہیں ہو گا۔ لیکن یہ تمام تصریحات جس ذہن کی غمازی کرتی ہیں وہ مریض ذہن ہے جو یکسوئی کے ساتھ شریعت کی بالادستی کو تسلیم کرنے سے احتراز کر رہا ہے اور طرح طرح سے چون وچرا کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ ان اضافوں نے شریعت ایکٹ کے مشن کو پامال کیا ہے اور ملک کی سیاسی قیادت کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں بجا طور پر شکوک وشبہات پیدا کیے ہیں۔

۵۔ غیر مسلموں کے حقوق کے لیے استثنائی دفعہ: اس سلسلہ کی آخری چیز وہ اضافہ ہے جسے غیر مسلموں کے حقوق کے نام پر کیا گیا ہے۔ جہاں تک غیر مسلموں کے دستوری حقوق کا

تعلق ہے ان کی ضمانت اسلام نے دی ہے اور پاکستانی قوم نے ان کا مکمل احترام کیا ہے۔ شخصی قانون کی حد تک بھی پہلے سے یہ چیز شریعت بل کے ہر مسودہ میں موجود تھی، لیکن غیر مسلموں کی ''روایات، رسوم ورواج اور زندگی کے طریق کار'' کو استثنائی دفعہ [دفعہ ۱(۴)] میں شامل کرنا قطعاً غیر ضروری تھا۔ اس سے ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جب ملک کے پبلک لاء اور کسی کے رسوم ورواج اور ''طرز زندگی'' کے نام پر تصادم کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

یہ تمام وہ پہلو ہیں جن کی وجہ سے حقیقی نفاذِ شریعت کے باب میں شریعت ایکٹ کی کارکردگی متاثر ہو گی اور عوام اور اہل علم دونوں کی نگاہ میں شریعت ایکٹ کی افادیت مجروح ہوتی ہے۔ ہم نے اگر شریعت ایکٹ کو اس کی موجودہ شکل میں قبول کیا ہے تو وہ اس اسلامی اصول کی روشنی میں کیا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والے فوائد اس میں پائی جانے والی خامیوں سے زیادہ ہیں۔ لیکن شرعی اور عملی دونوں پہلوؤں سے ان خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی ہمارا دینی فرض تھا۔ ان تمام امور پر پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ کے باہر بند کمروں کے مذاکرات میں اور کھلی سیاسی بحث میں ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور ہم اپنے اس عزم کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ان شاء اللہ شریعت ایکٹ کی ان خامیوں کو دور کرانے کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ نیز اس امر کی بھی بھرپور کوشش کریں گے کہ دستوری ترمیم کے ذریعہ شریعت کو ملک کا بالاتر قانون تسلیم کیے جانے کے وعدے کو جلد از جلد پورا کیا جائے۔

(اکتوبر 1991ء)

نفاذ شریعت ایکٹ پر اعتراضات: ایک علمی محاکمہ

پارلیمنٹ میں ''نفاذ شریعت بل'' پیش ہوتے ہی ملک میں بحث کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو اس کے ایکٹ بن جانے کے بعد بھی جاری ہے۔ یہ کوئی نیا سلسلہ نہیں۔ جب بھی نفاذ شریعت کا مطالبہ ہوا ہے، یا اس کا امکان پیدا ہوا ہے یا اس حوالے سے کوئی قدم اٹھایا گیا ہے، اسی طرح بحث کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

اس بحث میں شریک ہونے والے کچھ وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ نفاذ شریعت ایکٹ کے قانون بنتے ہی نفاذ شریعت کا وہ وعدہ پورا ہو گیا جو قیام پاکستان کے وقت کیا گیا تھا، اور جس کا اعادہ پورے زور شور سے ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے دوران کیا گیا تھا۔ اور اس طرح قوم کا خواب شرمندہ تعبیر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہ طبقہ ارباب اقتدار کا ترجمان ہے اور اس وقت اس سے تعرّض کرنا ہمارے پیشِ نظر نہیں۔ کچھ اور لوگوں کے نزدیک اس ایکٹ سے نفاذِ شریعت کے عمل میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے، نہ ہو گی۔ ان کے نزدیک یہ اقدام ناکافی، غیر تسلی بخش اور ناقابل اعتبار ہے۔ جس طرح اور جس انداز میں یہ ایکٹ پاس ہوا ہے اس کی روشنی میں ان کے احساس کو بے وزن کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔ تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو سرے سے نفاذ شریعت چاہتے ہی نہیں، یا اس کے مخالف ہیں۔ وہ شریعت بل کی مخالفت کی آڑ میں دراصل شریعت کے نفاذ اور معاشرہ و ریاست میں قرآن و سنت کی بالادستی کی مخالفت کرتے ہیں۔ کہیں تھیوکریسی، کہیں ملّا کریسی، کہیں دستور، پارلیمنٹ کی بالادستی اور بنیادی حقوق، کہیں عدالتوں کے حق کے چھین لیے جانے کی دہائی دے کر، اور ان کے ختم ہو جانے کے موہوم اور بے بنیاد اعتراضات کی آڑ میں وہ انتہائی چابکدستی سے ایک ناواقف آدمی کے ذہن کو مسموم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

اس تیسرے گروہ کی طرف سے جو بحث ملک میں پچھلے چند مہینوں میں ہوئی ہے اور جو باتیں خود پارلیمنٹ میں کی گئی ہیں (بشمول اس اختلافی نوٹ کے جو اسمبلی کے چند ارکان نے سلیکٹ کمیٹی (Select Committee) کی رپورٹ کے ساتھ پیش کیا) وہ اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ اس ایکٹ اور اس کے بارے میں کہی جانے والی ان کی باتوں کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے تاکہ صرف ایکٹ ہی نہیں بلکہ خود نفاذ شریعت کے بارے میں ملک میں جو سوال اٹھائے گئے ہیں اور جو بحثیں برپا کی گئی ہیں ان کا محاکمہ کیا جاسکے، اور جہاں کہیں کچھ حقیقی غلط فہمیاں یا الجھنیں پائی جاتی ہیں ان کو دور کیا جاسکے۔ دراصل شریعت بل کی آڑ میں لادینی لابی (Secular Lobby) خود شریعت کو ہدف بنارہی ہے اور اسلام کے مقابلہ میں لادینیت (Secularism) اور لبرل ازم (Liberalism) میں ملک کے سیاسی مستقبل کو تلاش کررہی ہے۔ ضروری ہے کہ اس شرانگیز کوشش کا پردہ چاک کیا جائے۔ نیز اسلام اور اس کے قانون کے بارے میں جو غلط بیانیاں اور شرانگیزیاں (Insinuation) کی جارہی ہیں ان کا مثبت جواب دیا جائے۔ اس ضمن میں درج ذیل نکات پر توجہ دینا ضروری ہے۔

شریعت: ملک کا اعلیٰ ترین قانون

جب بھی شریعت حقیقتاً نافذ ہوگی، اسے ملک کے اعلیٰ ترین قانون کی حیثیت لازماً حاصل ہوگی۔ اس کے علی الرغم کہ دستور میں لکھے بغیر یہ بات کتنی مؤثر ہوگی، موجودہ شریعت ایکٹ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں شریعت کو پاکستان کا اعلیٰ ترین قانون (Supreme Law of Pakistan) تسلیم کیا گیا ہے۔

پاکستان کے دستور ۱۹۷۳ء میں اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے (دفعہ ۲)۔ پھر ۱۹۸۵ء میں قراردادِ مقاصد (Objectives Resolution) کو دستور کا قابل تنفیذ (Operative) حصہ قرار دیا گیا ہے (دفعہ ۲۔الف)۔ پارلیمنٹ کو پابند کیا گیا ہے کہ ملک میں کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے احکام کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ کہ

تمام مروجہ قوانین کو قرآن وسنت کے احکام کے مطابق تبدیل کیا جائے گا (دفعہ ۲۲۷)۔ ملکی قوانین کے احکام اسلام سے متصادم یا مطابق ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے ۱۹۸۰ء میں وفاقی شرعی عدالت (Federal Shariah Court) قائم کی گئی (دفعہ ۲۰۳-الف)۔ ان تمام دستوری دفعات کا تقاضا ہے کہ شریعت کو ملک کا بالاتر قانون صاف لفظوں میں تسلیم کیا جائے تاکہ اس امر کو تعبیر کے نتیجہ میں اخذ نہ کیا جائے بلکہ دستور کی واضح نص کے ذریعہ متعین کر دیا جائے۔

۱۹۸۵ء میں آٹھویں ترمیم کے وقت اس امر کا مطالبہ کیا گیا تھا، اور اس وقت قومی اسمبلی اور سینٹ نے علیحدہ علیحدہ قرار دادوں کے ذریعہ اس اصول کو تسلیم کیا تھا کہ قرآن وسنت ملک کا بالاتر قانون تسلیم کیے جائیں گے، لیکن اس وعدہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اب شریعت ایکٹ کے ذریعہ دستور کے اس منشاء کو قانون کا درجہ دیا گیا ہے، مگر حقیقی معنوں میں قرآن و سنت کو بالاتر قانون Supreme Law کی یہ حیثیت ابہام اور تنازع سے اسی وقت پاک ہوگی جب اس بات کو صاف الفاظ میں دستور ہی میں لکھا جائے۔ اس دستوری ترمیم کا وعدہ وزیراعظم جناب محمد نواز شریف صاحب نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس (۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء) میں عمرہ کے لیے تشریف لے جانے سے پہلے واضح الفاظ میں کیا تھا۔ شریعت ایکٹ کے ذریعہ اس مطالبہ کے تسلیم کیے جانے کا جو مرحلہ طے ہوا ہے وہ کمزور اور ناقص ہے۔ اب اصل کام اس وقت ہوگا جب دستور میں بھی یہ شامل کیا جائے کہ قرآن وسنت ہر قانون سے، بشمول دستور کے بالاتر قانون ہوں گے۔

ایکٹ پر اعتراضات اور ان کی حقیقت: شریعت ایکٹ کے مخالفین نے اس دفعہ کو خصوصیت سے اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں ان کے اعتراضات پر کلام کیا جائے۔ ہم معترضین کے محرکات پر بات نہیں کریں گے۔ البتہ ہماری کوشش ہوگی کہ جو علمی اعتراضات اس دفعہ پر کیے گئے ہیں ان کا تعاقب کریں۔ بنیادی طور پر پانچ اعتراضات ہیں جو اس دفعہ پر کیے گئے ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ کی گئی ہے کہ قرآن و سنت ملک کے قانون کا ماخذ (Source of Law)ہو سکتے ہیں، ملک کا بالاترین قانون (Supreme Law) نہیں۔اس لیے شریعت کو ملک کا بالاترین قانون کہنا صحیح نہیں۔اس مؤقف کی تائید میں دو باتیں کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ قرآن پاک میں احکام کے علاوہ امم سابقہ کے قصص و حکایات، اخلاق و اصول، ترغیب و ترہیب، انفس و آفاق کے شواہد سب ہی کچھ موجود ہے۔ اس بنا پر اسے بالاتر قانون نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت قانون کا اعلیٰ ترین ماخذ ہیں، خود قانون نہیں۔مزید دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن نے اپنے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ قانون ہے بلکہ اس نے اپنے آپ کو صرف ہدایت کہا ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ علماء اور خصوصیت سے اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والوں نے قیام پاکستان کے بعد سے قرآن و سنت کے ماخذ قانون بنائے جانے کا مطالبہ تو کیا ہے مگر بالاتر قانون بنانے کا نہیں کہا۔یہ ایک بالکل نئی بات ہے جو اب کہی جا رہی ہے۔

۳۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شریعت کو بالاترین قانون ماننے کے معنی یہ ہیں کہ پارلیمنٹ قانون سازی کے حق سے محروم ہو جائے گی اور یہ پارلیمنٹ کی بالادستی کے خلاف ہے۔

۴۔ چوتھا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ چونکہ اس کے نتیجہ میں عدالتیں شریعت کے نفاذ میں بلاواسطہ شریک ہو جائیں گی اور خلاف شریعت قوانین کو کالعدم کر سکیں گی، اس لیے ان کا یہ حق دراصل پارلیمنٹ کی بالاتر حیثیت کو مجروح کرے گا۔اس طرح ایک قسم کی دو عملی وجود میں آئے گی، جس سے بہت خلفشار پیدا ہو سکتا ہے۔

۵۔ ایک اور اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ عدالتوں کو شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار تو دیا جا رہا ہے لیکن عدالتوں، خصوصاً نچلی عدالتوں(Lower Courts) کے مجسٹریٹ اور جج حضرات شریعت کا کافی علم نہیں رکھتے اور وہ شریعت کی تعبیر و تشریح

میں فاش غلطیاں کر سکتے ہیں۔اس سے بھی ذہنی خلفشار اور قانونی الجھاؤ اور ژولیدہ فکری پیدا ہو گی۔ یہ صورت حال نفاذ شریعت کے لیے مدد و معاون نہیں ہو گی۔

ذیل کی سطور میں ان اعتراضات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

اللہ کی حاکمیت، قرآن کا نقطۂ نظر: ہماری نگاہ میں شریعت ایکٹ کی سب سے اہم، بلکہ اصل دفعہ، یہی ہے جو شریعت کو ملک کا بالا تر قانون قرار دیتی ہے۔ اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ اسلام اللہ کی حاکمیت کے اصول کو قائم کرتا ہے۔ اسلام نام ہی اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کو تمام معاملات میں ''حکم''یعنی اصل فیصلہ کرنے والا قرار دینا ہے۔ نہ فرد اصل فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے اور نہ پارلیمنٹ یا عدالت بلکہ سب اللہ کو اصل فیصلہ کرنے والی قوت تسلیم کرتے ہیں اور اس کے معنی قرآن و سنت کو، پورے قرآن کو، نہ کہ اس کے کسی جز کو اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنت کو، نہ کہ اس کے ایک حصہ کو فرقان یعنی حق و باطل میں تمیز کرنے والا ماننا ہے۔ قرآن اس حقیقت کو بہت صاف الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف ۱۲: ۴۰)

حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت (پرستش، بندگی اور اطاعت) نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ... وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ ۵: ۴۴، ۴۵، 47)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں... اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں... وہی فاسق ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ (النساء ۴: ۱۰۵)

ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس علم کے ساتھ فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دیا ہے۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ؕ (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

اور (اے نبیؐ) کہہ دو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے علم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (اس کتاب کے مطابق) عدل کروں۔

ستم ظریفی ہے کہ کہا گیا ہے کہ قرآن پاک نے اپنے آپ کو قانون نہیں کہا، بلکہ صرف ہدایت کہا ہے۔ حالانکہ قرآن اپنے بارے میں صاف الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ وہ اللہ کا قانون ہے اور فیصلہ کی میزان اور کسوٹی ہے۔ قرآن کے لیے الکتاب کا لفظ ساٹھ سے زیادہ بار استعمال ہوا ہے۔ کتاب کے معنی فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ خود قرآن پاک میں کتاب کا لفظ قانون خداوندی اور حکم کے معنی میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء ۱۰۳) کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (البقرۃ ۱۸۳) کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ (البقرۃ ۲۱۶)

مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب ''عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی'' میں اس پر مفید بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''کتاب کے معنی فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ جرمن لفظ (Vorschrift) اور فرانسیسی اور انگریزی لفظ (Prescription) روسی لفظ ''پریدپسیانئے'' اور ہسپانوی لفظ (Prescripcion) (معنی فرض و حکم) کا مادہ بھی کتاب ہی کے معنی رکھتا ہے'' (صفحہ ۸۲)

قرآنِ مجید نے اپنے لیے علم اور فرقان کی اصطلاحیں جب بھی استعمال کی ہیں، یہ اس کے بالاتر قانون اور فیصلہ کرنے والی آخری اتھارٹی ہونے کی حیثیت کو ثابت کرتی ہیں (ملاحظہ ہو امام راغب اصفہانی۔ المفردات)

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ (النور ۲۴:۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف تاکہ رسولؐ ان کے درمیان فیصلہ کرے، تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے تسلیم کر لیا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء ۴:۶۵)

پس اے نبیؐ! تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے تمام معاملات میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسر و چشم قبول کر لیں۔

اور اس بات کو دوسری جگہ فرما کر قرآن و سنت کے بالاتر قانون ہونے کے اصول کو خود قرآن نے ہمیشہ کے لیے طے کر دیا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (الاحزاب ۳۳:۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ کر دے تو پھر ان کے لیے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

وہ معترضین جو اس ایکٹ میں قرآن و سنت کے بالاتر قانون لکھنے پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں ہم ان کو دعوت دیتے ہیں کہ قرآن پاک کی مندرجہ بالا نصوص پر کھلے ذہن سے غور کریں اور پھر سوچیں کہ کیا قرآن بعینہٖ اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ اسے بالاتر قانون ہی تسلیم کیا جائے؟۔ اس کے ساتھ اس آیت کریمہ پر بھی غور کر لیں تو انہیں اپنی

پوزیشن پر نظر ثانی کرنے میں مدد ملے گی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ (آل عمران ۳:۲۳)

تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے ان کا حال کیا ہے ؟ انہیں جب کتاب الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلہ کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔

جب قرآن خود اس امر کا مطالبہ کرتا ہے کہ اسے بالاتر قانون مانا جائے تو پھر کوئی اور دلیل لانے کی حاجت نہیں۔ دستور میں قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کا دروازہ ضرور بند کیا گیا ہے مگر مثبت طور پر قرآن کو بالاتر قانون قرار نہیں دیا گیا، جو اس کا حقیقی مقام ہے۔ شریعت ایکٹ شریعت کی اس حیثیت کو واضح کرتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس بات کو دستور میں بھی واضح الفاظ میں درج کیا جائے تاکہ کسی دائرے میں بھی کسی طرح کا کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

کیا اسلامی حکومت کی بحث کوئی نئی بات ہے؟ کہا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی بات ہے جو پہلے نہیں کہی گئی۔ لیکن یہ اعتراض بھی حقائق سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اہل علم ہر دور میں اسلامی حکومت اور ریاست کی یہی تعریف بیان کرتے رہے ہیں کہ اس میں قرآن و سنت کو بالاترین قانون تسلیم کیا جاتا ہے۔

مولانا حامد الانصاری غازی ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والی کتاب ''اسلام کا نظام حکومت''، میں کہ جو تقسیم ملک سے قبل شائع ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی کئی بار شائع ہو چکی ہے، امام ابو حنیفہؒ کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ ''اسلام کا مقصد اسلام کی حکومت کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسلام کی حکومت کا مفہوم کیا ہے، صرف یہ کہ ہم سب خدا کے اطاعت گزار اور خدا کی

حکومت کے علمبر دار ہیں'' (الاسلام ھو التسلیم والانقیادلا و امر اللہ تعالیٰ۔ فقہ اکبر ص۷۹)
(اسلام کا نظام حکومت۔ تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۲۴)

یہی مصنف قرآن پاک کے ''قانونِ کلّی'' کی ہونے پر مفصل بحث کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ:

''قرآنِ حکیم اسلام کا قانون کلّی ہے'' (صفحہ ۱۲۹)

''قرآن عظیم کی قانونی حیثیت صاف اور شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ ہمیں اس کے صفحات میں مقنن اعلیٰ کے جو فرامین ملتے ہیں ان سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب روحانیت اور اخلاق کی طرح تہذیب و تمدن کا ضابطہ اور حکومت اور سلطنت کا قانون کلّی ہے'' (صفحہ ۱۷۳)

''اسلامی حکومت اپنی قلمرو میں ایک مکمل، بلند و بالاتر، تحریری مجموعہ قانون (قرآن حکیم اور کتاب مسطور) کی پابند ہے'' (صفحہ ۱۷۱)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ سنت اور قانون سازی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرآن مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کو اسوۃ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے۔'' (عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی (۱۹۸۱ء) صفحہ ۱۳۰)

محمد اسد (Leopold Weiss) اپنی کتاب ''اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول'' (ترجمہ مولانا غلام رسول مہر لاہور ۱۹۶۳ء) میں لکھتے ہیں:

اسلام نے مسلمانوں پر لازم قرار دے دیا ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلوں کو اس الٰہی قانون کی رہنمائی کے تابع رکھیں جو قرآن لے کر آیا ہے اور جس پر عمل کا نمونہ رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات نے پیش کیا۔ اس وجہ سے امت کے حق قانون سازی پر قطعی پابندیاں عائد ہو گئیں اور ارادہ عوام کو بالا تری حاصل نہ رہی جو مغرب کے تصور جمہوریت کا ایک جزو ہے۔ کتاب مذکور۔ (صفحہ ۳۹)

ہم نے یہ حوالہ جات ان اہل علم کے دیئے ہیں جو مطالبہ دستور اسلامی سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے تاکہ خالص علمی پوزیشن واضح ہو جائے۔ رہا معاملہ تحریک اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا، تو انہوں نے شروع ہی سے یہ بات کی تھی کہ شریعت بالاتر قانون ہے اور اس کا دستور کی زبان سے اظہار ضروری ہے۔ بلاشبہ انہوں نے قرآن و سنت کے ماخذ قانون ہونے کی بات بھی کی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ قرآن و سنت کو بالاتر قانون تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اسلام کے مقاصد کی تکمیل دونوں باتوں کے تسلیم کیے جانے سے ہوتی ہے۔ اپنی اس تاریخی تقریر میں جو ''پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے؟'' کے موضوع پر لاء کالج لاہور میں ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو کی گئی تھی اور جس سے مطالبہ نظام اسلامی کی مہم کا آغاز ہوا تھا، مولانا مودودی نے کہا تھا کہ ملک کی دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ:

> ''ریاست کا اساسی قانون شریعت خداوندی ہے۔ جو محمد ﷺ کے ذریعہ ہمیں پہنچی ہے''۔ (اسلامی قانون صفحہ ۵۲)

فروری ۱۹۵۸ء میں جو بین الاقوامی مجلس مذاکرہ لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس میں مولانا مودودیؒ نے ''اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل'' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے اپنے مقالہ میں فرمایا:

''اسلام اپنی ساری دعوت ہی اس بنیاد پر اٹھاتا ہے کہ انسان کو اپنی اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے اس قانون شرعی کو تسلیم کرنا چاہیے۔ جو اس نے اپنے انبیاء کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اس قانون شرعی کو ماننے اور اس کے مقابلہ میں اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانے کا نام وہ ''اسلام'' رکھتا ہے اور صاف صاف الفاظ میں انسان کے اس حق کا انکار کرتا ہے کہ جن معاملات کا فیصلہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا ہو ان میں وہ خود اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کرے''۔ (اسلامی ریاست صفحہ ۴۴۰)

پھر اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے صاف الفاظ میں انہوں نے کہا

"یہی محمدی تعلیم (یعنی قرآن و سنت) وہ بالاتر قانون (Supreme Law) ہے جو حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے"۔(اسلامی ریاست صفحہ ۴۴۰)

یہ چند اقتباس اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ قرآن و سنت کو بالاتر قانون تسلیم کرنا ہمارے مطالبہ میں ہمیشہ شامل رہا ہے۔ البتہ مخصوص حالات کی بناء پر جس موقع پر جتنی بات منوائی جا سکی اس کی کوشش کی گئی۔ سابقہ ۴۰ سال کے تجربے سے یہ سبق ملتا ہے کہ قانون اور دستور میں واضح الفاظ میں شریعت کو بالاتر قانون تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ یہی وہ صورت ہے جس میں مقننہ اور عدلیہ دونوں نفاذِ شریعت کے عمل میں بیک وقت مؤثر ہو سکیں گے۔ (دسمبر ۱۹۹۱ء)

معترضین کے اعتراض کی وجوہات

معترضین کے باقی نکات پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک اصولی نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات کی غلط فہمی خلط مبحث کا نتیجہ نہیں اور اخلاص پر مبنی ہے اس کی وجہ غالباً مندرجہ ذیل وجوہ میں سے ایک یا دونوں ہو سکتی ہیں:

ا۔ قانون کے مغربی تصور اور اسلامی تصور میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ مغربی تصور قانون میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف ان انسانی روابط و سلوک کے قواعد و ضوابط سے ہے جو بالآخر عدالتوں کے ذریعہ نافذ ہو سکیں اور جن کی عدم پابندی جرم و سزا پر منتج ہوتی ہے۔ مشہور ماہر قانون پیٹن (Paton) اپنی کتاب A Textbook of Jurisprudence میں قانون کی یہ تعریف کرتا ہے:

"قانون وہ آئینی نظام ہے جسے کوئی معاشرہ یا اجتماع اصطلاحاً یا رسماً اختیار کرے اور یہ اس مجموعہ قوانین پر مشتمل ہوتا ہے جسے یہ اجتماع اپنے ہاں ایک خاص مشینری کے قیام کے ذریعے بغرضِ حصولِ اطاعت نافذ کرنے کے لیے آمادہ ہو"۔(صفحہ ۸۵)

یہی وجہ ہے کہ قانون اور ریاستی اعتبار سے اسے نافذ کرنے کے لیے قوت قاہرہ لازم وملزوم ہیں۔

اس کے برعکس اسلام کا تصور قانون زیادہ وسیع ہے یہاں ہر قانون کے لیے عدالت کے ذریعہ نافذ ہونا ضروری نہیں ہے گو اسلامی قانون کا ایک حصہ ایسا ہے جو ریاست کی قوت قاہرہ کے ذریعہ نافذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون عبادات، معاملات، مناکحات، سیاست، مدن، جنگ و صلح سب پر حاوی ہے۔ شریعت کو بالاتر قانون ماننے کے معنی یہ ہیں کہ پوری شریعت بالاتر قانون ہو گی جس کا کچھ حصہ فرد خود اپنے اوپر نافذ کرے گا اور کچھ حصے حکومت کے اداروں کے ذریعہ نافذ العمل ہوں گے۔ اور اس طرح اخلاق اور قوت قاہرہ کے امتزاج سے فرد اور معاشرہ کی اصلاح کا کام انجام پاتا ہے۔

۲۔ دوسری وجہ کا تعلق قانون کی اس اینگلو سیکسن (Anglo-Saxon) روایت سے ہے جس سے ملک کا قانون دان طبقہ آشنا ہے۔ اس روایت کے مطابق کم از کم نظری طور پر، رائج ''مجموعہ قوانین'' سے ہٹ کر کسی بالاتر قانون کو ماننا اور پھر اس بالاتر قانون کی روشنی میں خود ''مجموعہ قوانین'' پر نقد و احتساب کا کام انجام دینا ایک غیر معروف سی شے ہے۔ پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون اعلیٰ ترین قانون سمجھا جاتا ہے، اور روایتی پوزیشن یہی ہے کہ پارلیمنٹ حاکم اعلیٰ ہے اور اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی!

اسلام تو ظاہر ہے کہ اس پوزیشن کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کی نگاہ میں فرد اور ریاست دونوں اور اس طرح خود ریاست کے اداروں میں پارلیمنٹ، انتظامیہ اور عدلیہ سب ایک بالاتر قانون کے تابع ہیں اور وہ ہے قرآن و سنت۔ اصل حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اللہ کا رسول ﷺ اس کے نمائندہ اور رسول کی حیثیت سے شارح کا مقام رکھتا ہے۔ پارلیمنٹ کا کام شریعت کے مطابق قانون سازی کرنا ہے۔ اور جن

معاملات میں کتاب و سنت خاموش ہوں ان کے بارے میں شریعت کے مقاصد کی روشنی میں نئی قانون سازی کرنا ہے۔

پارلیمنٹ کی بالادستی کا سوال: لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں عام طور پر ان سیکولر اور جمہوری ممالک میں بھی جو عوام کی حاکمیت اور پارلیمنٹ کی بالادستی کے اصول پر قائم ہیں، جہاں نظام جمہوری ہے لیکن روایات پر بھی قائم ہے، پارلیمنٹ یا مقننہ کی یہ حاکمیت مطلقہ تسلیم کی گئی ہے؟ کیا کہیں بھی پارلیمنٹ کا حق قانون سازی لامحدود ہے؟ کیا اس پر عموماً پارلیمنٹ سے ماسوا اداروں کو نقد واحتساب اور رد و قبول کا حق نہیں دیا گیا ہے؟ کیا خود پاکستان میں ایسا نہیں؟ اور کیا ایسا ہونے سے جمہوریت، رائے عامہ کی اور پارلیمنٹ کی بالادستی ختم ہو جاتی ہے؟

ان سوالات کے جائزہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ قرآن و سنت کی بالادستی اور اس ضمن میں نقد واحتساب کے اختیارات عدالتوں کو تفویض کرنے کے نتیجے میں پارلیمنٹ کی بالادستی ختم ہو جانے کا ڈھنڈورا کتنا بے بنیاد ہے۔

برطانیہ کی قانونی تاریخ کا بھی اگر جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ جدید سیکولر (لادینی) فکر کے غلبہ سے قبل وہاں بھی پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کو حقوق عامہ اور عقل سلیم پر فوقیت نہیں دی جاتی تھی۔ لارڈ جسٹس کوک (Sir Edward Coke) نے ۱۶۱۰ء میں ڈاکٹر بونہام (Thomas Bonham) کے مشہور مقدمہ میں اپنے فیصلہ میں لکھا تھا کہ:

> "جب پارلیمنٹ کا منظور کردہ کوئی قانون عمومی طور پر تسلیم شدہ حق (Common Right) یا عقل سلیم (Reason) کے خلاف ہوگا یا اس پر عمل ناممکن ہوگا تو پھر معاملے کا فیصلہ کامن لاء کی روشنی میں ہوگا اور ایسے وضعی قانون کو غیر مؤثر (Void) قرار دیا جائے گا"۔ [77 Eng. 647, 652 (1610)]

جسٹس کوک کے جانشین اور چیف جسٹس ہوبرٹ (Hobart) نے بھی اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے:

"پارلیمنٹ کا بنایا ہوا ایک وضعی قانون بھی، اگر وہ فطری انصاف (Natural Equity) کے خلاف ہے تو اسے غیر مؤثر قرار دیا جائے گا"۔

[Day vs Savadge, 80, ER. 235 237 (1615)]

اسی طرح چیف جسٹس ہولڈ (Hold) نے بھی اس مؤقف کی تائید کی۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جس میں دستور مملکت کو ایک تحریری دستاویز میں منضبط کیا جانے لگا۔ امریکہ میں تحریری دستور بننے کے بعد دستور کو بالاتر قانون تسلیم کیا گیا اور کانگریس قانون سازی میں اس کے تابع ہے۔ جسٹس جان مارشل (John Marshal) کا یہ فیصلہ آج تک امریکی قانونی روایت کی بنیاد ہے کہ:

"دستور خود سب سے بڑا قانون ہے اور یہ ذمہ داری عدالتوں کی ہے نہ کہ مقننہ کی، کہ کونسا قانون دستور کی حدود سے تجاوز کر گیا ہے اور کس بناء پر وہ غیر مؤثر ہے۔" (Marbury vs Madison)

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال میں امریکہ کی عدالت عالیہ نے دو سو سترہ قوانین کو خلاف دستور، بے ضابطہ اور غیر موثر قرار دیا ہے اور اس سے نہ مقننہ کی ناک کٹی ہے، نہ اس کی بالادستی پر کوئی حرف آیا ہے اور نہ عدالت کی آمریت کا کوئی ہوا کھڑا ہوا ہے۔ بلکہ مقننہ کا قانون سازی کا حق اور عدلیہ کا قانون کو "بالاتر قانون" کی میزان پر پرکھنے کا اختیار، دونوں جمہوری روایت کا حصہ تسلیم کیے جاتے ہیں، ان جمہوری روایات کا، جو حاکمیتِ الٰہی نہیں بلکہ حاکمیتِ جمہور پر قائم ہیں۔

دنیا کے دساتیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر ممالک میں بالاترین پارلیمنٹ کے لیے ضروری ہے کہ وہ دستور کے مطابق قانون سازی کا کام انجام دیں۔ فرانس، کینیڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، ایران اور کیمرون میں تو ایسی دستوری کونسل کا وجود ہے جو پارلیمنٹ میں کسی بل کے پیش ہونے کے بعد اور پارلیمنٹ میں اس کے منظور ہونے یا صدر کی توثیق سے پہلے ہی اس بل کے دستوری یا دستور سے متصادم ہونے کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ مگر دنیا کے بیشتر

ممالک میں عدالتوں ہی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک بل کے منظور ہونے کے بعد بھی اس کا جائزہ لیں اور اگر اسے دستور سے متصادم پائیں تو کالعدم قرار دے دیں۔

ارجنٹائن میں یہ مقام عام عدالتوں کو دیا گیا ہے۔ آسٹریلیا، ڈنمارک، اسرائیل، اردن، ناروے، پاکستان، ہندوستان اور امریکہ میں یہ اختیار عدالت عالیہ کو حاصل ہے جس کے فیصلہ پر آخری فیصلہ سپریم کورٹ کرتی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک میں قانون منظور ہو جانے کے بعد اعلیٰ عدالتوں میں صرف سپریم کورٹ ہی قوانین کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ یہ پوزیشن آسٹریا، برازیل، کیمرون، کوسٹاریکا، آئرلینڈ، جاپان، ویت نام، سینیگال میں پائی جاتی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک میں ایک علیحدہ دستوری عدالت یا کونسل قائم کی گئی ہے جس کا کام صرف دستوری امور کا فیصلہ کرنا ہے۔ ایسی دستوری عدالتیں آسٹریا (Austria) جرمنی، اٹلی، مالٹا، کوریا، اسپین، سری لنکا، اور یوگوسلاویہ میں قائم ہیں۔ ہندوستان میں تو سپریم کورٹ عام قوانین ہی نہیں، دو تہائی اکثریت سے منظور شدہ دستوری ترمیم کو بھی غیر دستوری قرار دینے کی روایت قائم کر چکی ہے اور اس سے بھی پارلیمنٹ کی بالادستی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کو عدالت کے احتساب کے لیے کھولنا جمہوری روایت کا حصہ ہے۔ اس سے نہ پارلیمنٹ کی حاکمیت پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ پارلیمنٹ پر عدلیہ کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔ ہمارے قانون ساز اداروں کے ان ارکان کو جو پارلیمنٹ کی بالادستی کی دہائی دے کے شریعت کی بالادستی کی مخالفت کرتے ہیں وہ خود بے شمار معاملات میں پارلیمنٹ کے قوانین کو مسترد کرنے کا حق عدالتوں کو تفویض کرتے ہیں۔ پھر صرف شریعت کے معاملہ میں ہی ایسی حساسیت یا نزاکت کا مظاہرہ کیوں؟ جدید سیاسی نظریہ تو مبنی ہی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان توازنِ اختیار (Balance of power) پر ہے۔ اس سے کسی ایک ادارہ پر دوسرے کی بالادستی قائم نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور متعلق ہوتا ہے کہ عوام کے حقوق محفوظ ہو سکیں اور ریاست کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔

کیا پارلیمنٹ کی بالادستی صرف شریعت سے ہی متاثر ہوتی ہے؟ پارلیمنٹ کے جن ارکان یا دوسرے مبصرین نے شریعت کے بالاتر قانون تسلیم کیے جانے سے پارلیمنٹ کی حاکمیت پر حرف آنے کی دہائی دے کر جس نازک مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ناقابل فہم ہے۔ شریعت کی بالادستی پر، جس کے اقرار ہی سے ہم مسلمان بنتے ہیں تو وہ اتنے برافروختہ ہیں، لیکن اس امر پر ان کی پیشانی پر شکن بھی نہیں پڑتی کہ بہت سے معاملات میں پارلیمنٹ کے ہاتھ اور پاؤں آج بھی بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس دستور کے تحت بندھے ہوئے ہیں جسے ۱۹۷۳ء کا "اصل دستور" کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر قانون سازی کے لیے دو فہرستیں دستور میں دی گئی ہیں، اور ان سے ہٹ کر پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں کے لیے قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح صوبوں کی حدود کے بارے میں پارلیمنٹ صرف اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ دفعہ ۲۲۷۔ احکامات اسلامی کے بارے میں پارلیمنٹ کے اختیارات کی تحدید کرتی ہے۔ دستور اور دستور کے شیڈولڈز کی بناء پر ۲۵ قوانین ایسے ہیں اور ان میں سے بیشتر قوانین وہ ہیں جو فوجی آمریت کے ادوار میں بنائے گئے تھے، جن میں عام قانون سازی کے طریقے پر کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ ۱۹۷۳ء کے اس دستور میں جسے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے منظور کرایا تھا، وزیراعظم کے ایک بار منتخب ہو جانے کے بعد اس کو عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعہ ہٹانے کے معروف طریقہ کو اس طرح جکڑ بندیوں کا شکار کرایا گیا تھا کہ عملاً پارلیمنٹ اور خود حکمران پارٹی کو وزیراعظم کو ہٹانے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس پر خود بھٹو صاحب کے سابق وزیر قانون جناب محمود علی قصوری نے بڑے سخت الفاظ میں اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ دستور کی دفعہ ۸ میں بھی پارلیمنٹ کے حق قانون سازی پر بھی پابندی عائد کی گئی ہے اور صحیح طور پر کی گئی ہے۔ لیکن اتنے بہت سے "بالاتر قوانین" کی موجودگی میں پارلیمنٹ کی "حاکمیت اعلیٰ" متاثر نہیں ہوئی، البتہ اللہ کی شریعت کو بالاتر قانون تسلیم کرنے سے اس کی ناک کٹ جاتی ہے؟ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!

عدلیہ کی اصلاح اور تربیت: تیسرے اور چوتھے اعتراض کے بارے میں مندرجہ بالا معروضات کافی ہیں۔ البتہ آخری اعتراض میں وزن ہے مگر اس کا مناسب حل ممکن ہے اور ضرور کیا جانا چاہیے۔ چونکہ ہمارا تعلیمی نظام اور خصوصیت سے قانون کی تعلیم کا نظام ناقص ہے، اسی طرح عدلیہ کے لیے تقرری کا معیار (Criterion) بھی اسلامی اعتبار سے ناکافی ہے اس لیے ان سب کی اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ فی الحقیقت عدلیہ میں ہر سطح پر جدید قانون اور اسلامی فقہ اور اصول فقہ کا علم رکھنے والے افراد آسکیں۔ اس کمی کا تقاضہ ہے کہ اسے جلد از جلد پورا کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عدلیہ کے موجودہ افراد کے لیے خصوصی تربیتی پروگرام اعلیٰ جوڈیشل اکیڈمی کے تحت فوری طور پر شروع کیے جائیں، عدلیہ میں مختلف سطح پر دینی علم رکھنے والے علماء اور فقہاء کا تقرر بطور جج، مفتی یا مشیر عدالت کیا جائے اور مستقبل کے لیے قانون کی تعلیم کے نظام کی اصلاح اور عدالت میں تقرری کے معیار کو وسیع کیا جائے تاکہ مستقبل کی عدلیہ جدید قانون اور اسلامی فقہ اور اصول دونوں پر مہارت رکھنے والوں پر مشتمل ہو سکے۔

البتہ اعتراض کا یہ پہلو قطعاً ناقابل قبول ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ چونکہ ایسے افراد نہیں ہیں اس لیے شریعت کے نفاذ کے عمل میں عدلیہ کو کوئی کردار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر یہ دلیل صحیح ہے تو پھر ہم بڑے ادب سے عرض کریں گے کہ جو حالت آج قانون ساز اداروں کے ارکان کی علوم دینی و دنیاوی پر مہارت کی ہے اس کی روشنی میں تو ان کو قانون سازی کے اختیارات دینا بھی محل نظر ہو جائے گا۔ مسئلہ کا حل اس کمی کو پورا کرنا ہے جو عدلیہ کے موجودہ نظام میں ہے اور اسی طرح خود مقننہ اور اس کے افراد کے معیار کو بلند کرنے کی بھی فکر ہونی چاہیے۔ جیسا کہ دستور کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کا تقاضا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی غیر متعلق نہیں ہوگا کہ جب برطانوی دور میں شخصی قانون کو سامراجی قوتوں کے مسلط کردہ قانون کے دائرے سے باہر رکھا گیا اور اسے مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے اپنے مذہبی قانون کے تابع کیا گیا تب بھی اس خدشہ کا

اظہار ہوا تھا کہ ایک مذہبی قانون کو نافذ کرنے کی ذمہ داری اس عدلیہ کو دی جارہی ہے جو اس قانون کی ماہر نہیں۔ بلکہ وہاں تو مسلم پرسنل لاء کا نفاذ غیر مسلم ججوں تک کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن چونکہ قانون کی مسلمہ کتابوں اور مآخذ کا بالعموم احترام کیا گیا اس لیے انگریز کے سو سالہ دور میں چند ہی واقعات ایسے ہوئے جب عدلیہ کا فیصلہ فقہ اور اصول فقہ کے خلاف تھا، اور ان حالات میں مسلمان اہلِ علم اور وکلاء نے تنقید و احتساب کے ذریعہ صحیح اسلامی پوزیشن کو پامال ہونے سے بچالیا۔

گزشتہ دس بارہ سال کا تجربہ بھی اس کا گواہ ہے کہ عدلیہ کے فیصلوں میں اب شریعت اور اس کے احکام و قوانین پر زیادہ کھل کر بحث ہو رہی ہے اور مسلمان فقہاء کی آراء سے استشہاد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایک مثبت عمل ہے اور اس کے اچھے نتائج نکلیں گے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہماری رائے میں کسی قانون کے شریعت سے خلاف ہونے کے بارے میں فیصلہ کا اختیار موجودہ حالات میں فیڈرل شریعت کورٹ یا اعلیٰ عدالتوں (ہائی کورٹ، سپریم کورٹ) تک محدود کرنا قرینِ حکمت ہے۔ یہی مؤقف سینیٹ میں پاس شدہ بل میں اختیار کیا گیا تھا اور ہم اسے موجودہ ایکٹ سے رونما ہونے والی پوزیشن کے مقابلہ میں واضح سمجھتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں اس مسئلہ پر حکومت اور پارلیمنٹ کو غور و فکر جاری رکھنا چاہیے۔ اور جتنا جلد ممکن ہو ترمیم کے ذریعہ اس پوزیشن کو واضح کر دینا چاہیے۔ البتہ جب چند سالوں کے تجربہ سے، اور عدالتی نظام میں ہر سطح پر دین کا علم رکھنے والے لوگوں کے شامل ہو جانے سے، صورت حال بہتر ہو جائے تو پھر دائرہ کو وسیع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہو گا۔ آخر بارہ تیرہ سو سال تک مسلمانوں کے نظام قضاء میں نچلی اور اعلیٰ دونوں سطح کے قاضی ہی ان امور پر فیصلہ کرتے رہے ہیں اور کبھی ذہنی خلفشار کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ اگر کہیں فیصلہ میں خطا ہوتی ہے تو جلد ہی اسکی اصلاح بھی اسی نظام کے اندر ہو گئی ہے، اور یہی فکری اور عملی ترقی کا راستہ ہے۔ (جنوری ۱۹۹۲ء)

پارلیمنٹ کی استعداد اور عدالتوں کا کردار: کیا عدالتوں کو شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا یا

پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھنے کا اختیار دینے یا عدالتوں میں علماء دین کو بحیثیت جج یا مشیر مقرر کرنے کا دروازہ کھولنے سے ایسی ملّا کریسی قائم ہو جائے گی جو بنیادی حقوق، جمہوریت، عورتوں کی حیثیت اور دیگر امور میں ہمارے معاشرہ کو پیچھے لے جائے گی اور تاریکی اور ظلم کی رات قوم پر مسلط ہو جائے گی؟ کیا پارلیمنٹ جو قرآن و سنت کے خلاف قانون نہ بنانے کی اور رائج قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کی بھی پابند ہے، کسی نقد و احتساب کے بغیر ان فرائض کو کسی درجہ میں بھی تشفی بخش طور پر انجام دے سکی ہے یا مستقبل قریب میں دے سکے گی؟ دوسرے الفاظ میں کیا نفاذ شریعت کا کام کلیتاً پارلیمنٹ پر چھوڑ دینا چاہیے اور وہ اس مقصد کے لیے کافی ہے جیسا کہ شریعت بل کے بعض مخالفین کہتے ہیں؟ یہ سوالات بھی غور و فکر کے محتاج ہیں۔ اس ضمن میں ماضی کا واقعاتی جائزہ بھی مفید ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ مختلف دساتیر میں (یعنی ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں) قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی پر پابندی عائد کی گئی لیکن پارلیمنٹ کے ذریعہ قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کا عمل رونما نہ ہوا۔ پھر ۱۹۸۰ء میں فیڈرل شریعت کورٹ قائم ہوئی۔ یہ مثبت اقدام تھا۔ گو اس کورٹ کی تشکیل اور اس کے اختیارات دونوں میں متعدد خامیاں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ پہلا ادارہ ہے جس نے عملاً ملکی قوانین کو اسلام کے ہم آہنگ کرنے کا کام سنجیدگی سے شروع کیا۔ ملک کے تقریباً ۴ ہزار قوانین میں سے تقریباً ۱۴۰۰ کا جائزہ اس عدالت نے اپنے ان اختیارات کے تحت لیا جو دستور نے اسے استغاثہ یا اپنی صوابدید (Suo Motu) پر غور و جائزہ کے لیے دیئے ہیں۔ عدالت نے ان میں سے ۱۵ قوانین کو مکمل طور پر قرآن و سنت کے منافی قرار دیا ہے۔ اور ۳۰ میں جزوی ترامیم تجویز کی ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اپنے طور پر یہی کام کیا ہے اس نے ۱۹۸۵ء تک پارلیمنٹ کو اکتالیس (۴۱) رپورٹیں پیش کی ہیں جن میں تقریباً ۵۰۰ قوانین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ پارلیمنٹ نے ۱۹۸۵ء سے لے کر آج تک ان

تمام رپورٹوں کی روشنی میں کوئی قابل ذکر قانون سازی نہیں کی۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلوں کے دباؤ کے تحت صرف چند قوانین میں جزوی ترامیم منظور کی گئی ہیں اور یہاں بھی دو درجن سے زیادہ قوانین کے سلسلہ میں حکومت سپریم کورٹ میں اپیل کے لیے چلی گئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے مرتب کردہ نئے مسودہ ہائے قانون یا مروجہ قوانین میں مجوزہ ترامیم پر اب تک غور و فکر کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔ پارلیمنٹ کی اس کارکردگی کے برعکس اگر قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کا کوئی کام ہوا ہے تو وہ صرف فیڈرل شریعت کورٹ کے ان فیصلوں کی بناء پر ہوا ہے جو دستور کی رو سے نافذ العمل تھے۔

ہماری نگاہ میں یہ بھی ایک سانحہ سے کم نہیں ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ اور ملک کی اعلیٰ عدالتوں نے شریعت کی بالادستی کے قیام کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کا نہ عوام میں کوئی ادراک ہے اور نہ صحافت اور پارلیمنٹ میں اس کی کوئی گونج سنائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نام نہاد ترقی یافتہ اور لبرل حضرات جن کی زبانیں انسانی حقوق کی بات کرتے نہیں تھکتیں وہ بھی خود بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں ان سنہری خدمات کے بارے میں خاموش ہیں جو فیڈرل شریعت کورٹ نے احکام اسلام کی بنیاد پر انجام دی ہیں۔

اس عدالت کے فیصلوں کے ذریعے سرکاری ملازمین بشمول فوجی ملازمین اور غیر سرکاری اداروں کے کارکنوں کو یہ اسلامی حق ملا کہ انہیں دفاع کا موقع دیئے بغیر کسی بھی ملازمت سے فارغ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ۲۵ سال کی ملازمت کے بعد جبری ریٹائرمنٹ کے اختیار کو اسلامی بنیادوں پر مقیّد کیا گیا۔ بدنام زمانہ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس جس کی ہر سیاسی گروہ نے مذمت کی تھی اور برسرِ اقتدار آکر اس کی حفاظت کی تھی، اس کو ختم کرنے کا سہرا بھی فیڈرل شریعت کورٹ کے سر ہے۔ اس قانون کو فیڈرل شریعت کورٹ نے خلافِ اسلام قرار دیا۔ اور پھر سپریم کورٹ کی شریعت بنچ کے فیصلے کے تحت ۱۹۸۸ء میں یہ کالا قانون ختم ہوا۔ اسی طرح خود قانونِ فوجداری میں قتل کے سامراجی قانون کا خاتمہ اور اسلام کے قانون قصاص کا نفاذ پارلیمنٹ کی سعی و جدوجہد کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ فیڈرل شریعت کورٹ اور

سپریم کورٹ کی شریعت بنچ کی مساعی کے نتیجہ میں نافذ ہوا ہے۔

پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کی خدمات صرف فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلوں تک محدود نہیں۔ سپریم کورٹ نے ان ادوار میں بھی جب ملک فوجی آمریت کی گرفت میں تھا اور دستور سے محروم تھا اپنے فیصلوں میں واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا تھا کہ قرار داد مقاصد دستور کی عدم موجودگی میں بھی ملک کے اعلیٰ تر قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر جب ۱۹۸۵ء میں قرار داد مقاصد کو دستور کا حصہ بنا دیا گیا (دفعہ ۲۔الف) تو سندھ اور پنجاب دونوں کی عدالت ہائے عالیہ کے ججوں نے اپنے کئی فیصلے قرار داد مقاصد کی روشنی میں مروجہ قانون کے خلاف کیے اور قانون کے ان حصوں کو دستور کے خلاف قرار دیا جو قرار داد مقاصد سے متصادم ہیں۔ اعلیٰ عدالتوں نے گزشتہ گیارہ سال میں شریعت کے عملی نفاذ کی نئی راہ کھولنے کی کوشش کی ہے اور بحیثیت مجموعی ان کا ریکارڈ بہت نمایاں اور روشن ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس کی روشنی میں شریعت ایکٹ کے تحت عدالتوں کو اختیارات تفویض کیے جانے کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے نفاذ شریعت کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کی پارلیمنٹ قانون سازی کرے اور جس حد تک وہ قانون کو مدوّن (Codify) کردے شریعت کے قوانین اس حد تک نافذ ہو جائیں۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۸۰ء تک نفاذِ شریعت کا صرف یہی ایک راستہ تھا اور اس پورے دور کا ریکارڈ بڑا ہی مایوس کن ہے۔

۱۹۷۹ء میں صدر ضیاء الحق صاحب نے آرڈی نینس کے ذریعہ چند قوانین کو نافذ کیا۔ ان میں چار حدود آرڈیننس، ایک آرڈیننس جس کے ذریعے دُرہ کی شرعی سزا کے نفاذ کا طریقہ بیان کیا گیا ہے، اور ایک آرڈیننس زکوٰۃ اور عشر کے نفاذ کے بارے میں تھا۔ ایک دستوری ترمیم کے ذریعہ فیڈرل شریعت کورٹ کے قیام کے بعد جس نے ۱۹۸۰ء میں کام شروع کیا نفاذ شریعت کے عمل میں عدالت کی شرکت نے ایک نئی اور واضح شکل اختیار کی۔

فیڈرل شریعت کورٹ کو قانون سازی کا کوئی اختیار حاصل نہیں البتہ دستور کے تحت اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ خود اپنی صوابدید، یا کسی شہری یا مرکز یا صوبائی حکومت کی درخواست پر ملک کے رائج الوقت قوانین میں سے کسی ایسے قانون کا جو اس کے دائرہ اختیار میں آتا ہو[1] جائزہ لے سکے اور اس قانون یا قانون کے اس حصہ کو جو اس کی رائے میں قرآن و سنت کے احکام سے متصادم ہے، خلافِ شریعت ہونے کی بناء پر کالعدم قرار دے سکے۔ البتہ عدالت کے لیے لازم ہے کہ متعلقہ حکومت کو اپنا مؤقف پیش کرنے کا موقع دے، اپنے فیصلے میں وہ دلائل لکھے جن کی بناء پر وہ قانون یا اس کے کسی حصہ کو شریعت کے خلاف پاتی ہے اور قانون ساز ادارے کو مہلت دے تاکہ وہ متعلقہ قانون میں تبدیلی کر سکے۔ بصورت دیگر جس تاریخ کا عدالت نے تعین کیا ہے اس تاریخ کو وہ قانون یا قانون کا وہ حصہ جسے عدالت نے خلاف شریعت قرار دیا ہے کالعدم ہو جائے گا اور کتاب قانون کا حصہ نہیں رہے گا۔

اس طرح فیڈرل شریعت کورٹ کے قیام کے بعد نفاذِ شریعت کا ایک دوسرا دروازہ کھل گیا۔ اور جس طرح امریکہ، ہندوستان، پاکستان اور دنیا کے دوسرے ان تمام ممالک میں جہاں تحریری دستور کی رو سے عدالت عالیہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ دستور سے متصادم قوانین کو کالعدم کر سکیں، اسی طرح پاکستان کی فیڈرل شریعت کورٹ اور اعلیٰ عدالتوں کو بھی یہ اختیار مل گیا کہ وہ احکام شریعت کی بنیاد پر ملکی قوانین کا جائزہ لیں اور جہاں انہیں شریعت سے متصادم پائیں اس حد تک ان قوانین کو کالعدم کر سکیں۔ جیسا ہم نے دیکھا ان اختیارات سے نہ صرف نفاذ شریعت کی راہ میں پیش رفت ہوئی، بلکہ بنیادی حقوق اور آزادیوں اور جمہوریت کے ضمن میں بھی تاریخی فیصلے ہوئے۔ اور یہ ناگزیر تھا اس لیے کہ شریعت سے بڑھ کر تو کوئی چیز بھی بنیادی حقوق اور آزادیوں اور جمہوریت کی محافظ نہیں ہو سکتی۔

---

[1] دستور، مسلم پرسنل لاء، ضابط فوجداری اور ضابطۂ دیوانی اس عدالت کے اختیار سے مستقلاً باہر ہیں اور مالی اور محصولاتی قوانین دس سال کے لیے اس کے دائرہ کار سے باہر تھے۔ یہ استثنیٰ دس سال پورے ہونے پر جون ۱۹۹۰ء سے ختم ہو چکا ہے۔

اس طرح یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ شریعت ایکٹ کے تحت عدالتوں کو جو کچھ بھی اختیار دیے گئے ہیں ان سے نہ صرف پارلیمنٹ کی بالادستی مجروح نہیں ہوتی بلکہ بنیادی حقوق اور جمہوریت کو بھی زیادہ مستحکم تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے بہترین طریقہ کونسا ہے۔ مدون قانون کا یا غیر مدون قانون بذریعہ عدالت کا۔ دونوں طریقوں میں جہاں کچھ مفید پہلو ہیں وہیں ان میں کچھ مشکلات بھی ہیں۔ ہماری نگاہ میں اب وقت نظری بحثوں کا نہیں عملی اقدام کا ہے۔ اور اس پہلو سے جہاں یہ ضروری ہے کہ اسلامی قانون کو جلد از جلد مدوّن کیا جائے اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں اس کام کو اوّلیت دیں، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو سامراجی دور کے ان قوانین سے جلد از جلد نجات دلائی جائے جو خدا سے بغاوت پر مبنی اور سامراجی مقاصد کو پورا کرنے والے ہیں اور جس حد تک معاملات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہو سکتے ہیں اس کا دروازہ کھولا جائے۔ جس طرح عدالتیں غلطی کر سکتی ہیں اسی طرح پارلیمنٹ بھی منزہ عن الخطاء نہیں ہے۔ عدالت کے فیصلے بھی کھلے میدان میں ہوتے ہیں۔ اگر کہیں کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اعلیٰ عدالتیں اس کی تصحیح کر سکتی ہیں۔ اہل علم بھی بحث و گفتگو کے ذریعہ شریعت کی بہتر تفہیم میں بہترین کردار ادا کر سکتے ہیں۔ شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ہر ممکن راستہ اختیار کیا جائے اور اس سلسلہ میں جہاں بھی موانع پائے جاتے ہیں ان کو دور کیا جائے اور پارلیمنٹ اور عدالتوں کو متحرک کر کے اس سلسلہ میں بڑی مفید خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

یہاں ضمناً اس اہم بات کی طرف بھی توجہ دلانا مفید ہوگا کہ اس وقت ملک میں جو تقریباً ۴ ہزار قوانین رائج ہیں ان میں سے ۹۵ فیصدی انگریزی دور اقتدار میں کتاب قانون کا حصہ بنے۔ آزادی کے دور میں قانون سازی کا کام بہت ہی سست رہا ہے اور ہمارے قانون ساز ادارے آزادی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ایک طرف ترقی پسندی اور اکیسویں صدی میں داخلے کی باتیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف انیسویں صدی کے

سامراجی دور کے قوانین کو سینے سے لگایا ہوا ہے۔ نفاذِ شریعت ایکٹ اس سامراجی قانونی ورثہ کے لیے ایک چیلنج اور تازیانہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جلد از جلد غلامی کے اس ورثہ سے نجات ملے۔ ایک آزاد اسلامی اور رفاہی ریاست کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ دورِ غلامی کے قوانین پر جلد از جلد نظر ثانی ہو اور اسلام کے اصول عدل و انصاف اور دورِ جدید کے اصلاحی اور فلاحی تجربات کو سامنے رکھ کر کتاب قانون کو از سر نو مدوّن کیا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو قوم کو اکیسویں صدی کے خیر مقدم کے لیے تیار کر سکتی ہے۔

سامراجی دور کے قوانین اور اسلام اور آزادی کے تقاضوں میں تصادم کی صرف ایک مثال پر ہم یہاں اکتفاء کرتے ہیں۔ پولیس ایکٹ جو ۱۸۶۱ء میں نافذ ہوا اس کا مقصد اور مزاج یہ ہے کہ ایک سامراجی حکومت مقامی آبادی کو کس طرح اپنے قابو میں رکھے اور یہاں اٹھنے والی آزادی کی ہر تحریک کو کسی طرح دبا سکے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انیسویں صدی میں خود دولت برطانیہ میں پولیس کے قانون کے دو ماڈل تھے۔ ایک وہ جو انگلستان میں رائج تھا اور جس میں پولیس اور عوام میں حاکم اور محکوم کا نہیں بلکہ خادم اور مخدوم کا رشتہ تھا اور دوسرا وہ جو آئر لینڈ میں نافذ تھا اور جہاں انگلستان کی حیثیت حاکم اور آئر لینڈ کے لوگوں کی حیثیت ایک قسم کے غلام کی تھی۔ ۱۸۶۱ء کے پولیس ایکٹ میں آئر لینڈ کے ماڈل کو اصل ماخذ بنایا گیا ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ محکوم ہندوستان میں بھی چونکہ تین شہروں میں انگریز رہتے تھے اس لیے ان شہروں کے لیے پولیس ایکٹ میں خصوصی تبدیلیاں کی گئیں اور باقی سارے ہندوستان کے لیے حاکم نے پولیس کو محکوم آبادی کو کنٹرول کرنے کا آلہ کار بنایا۔ لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی آزادی کی کوئی لہر اس قانون تک نہ پہنچ سکی۔ نفاذِ شریعت ایکٹ قوم کے سامنے وقت کے اہم ترین قانونی ایجنڈے کو نمایاں کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قانون کے اس پشتارے کو اسلام اور آزاد جمہوری معاشرہ سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ (فروری ۱۹۹۲ء)

نفاذ شریعت اور قائدِ اعظم: آخر میں ہم قائدِ اعظمؒ، اسلامی قانون و ریاست اور تھیوکریسی کے بارے میں کچھ گزارشات کرنا چاہتے ہیں۔ ان امور پر انگریزی اخبارات و رسائل اور خود

پارلیمنٹ کی بحث میں چند ارکان نے بہت کچھ زہر اگلا ہے اور ایسے دعوے کیے گئے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ کہی گئی ہے کہ قائدِ اعظم اسلامی ریاست کے قیام کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنایا جائے جب کہ شریعت کی بالادستی کی بات ہی کبھی نہیں کی بلکہ وہ تھیوکریسی یعنی اسلامی ریاست کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنایا جائے جب کہ شریعت ایکٹ اسے ایک ''تھیوکریسی'' میں تبدیل کر دے گا۔

یہ بات صرف وہی افراد کہہ سکتے ہیں جو یا تو قائدِ اعظم کے افکار و اعلانات اور ان وعدوں سے واقف نہیں جو انہوں نے ۱۹۴۰ء سے لے کر اپنے آخری خطاب جولائی ۱۹۴۹ء تک قوم سے بار بار کیے۔ یا پھر وہ قائدِ اعظم کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور خود قائد اعظم پر دوغلے پن اور دھوکہ دہی کا الزام لگانا چاہتے ہیں۔

قائدِ اعظم نے مارچ ۱۹۴۱ء میں فرمایا:

''ہندوستان کی تقسیم اس لیے ضروری ہے کہ دونوں قومیں اپنے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق معیشت، معاشرت، ثقافت اور سیاحت میں آزادانہ طور پر زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکیں۔ یہ ساری جدوجہد اس لیے ہے کہ اس کے پورے پورے مواقع حاصل ہوں اور مسلمان اپنے قومی عزائم کو بروئے کار لا سکیں۔ ہم جس اہم نزاع میں مبتلا ہیں وہ صرف مادی فوائد کے لیے نہیں بلکہ فی الحقیقت مسلم قوم کی روح کی بقاء کے لیے ہے''۔

مارچ ۱۹۴۴ء میں آپ نے فرمایا:

''ہمارا یہ اعتقاد ہے اور ہم اس کے مضبوطی سے قائل ہیں کہ ہندو اور مسلمان قومیت کے ہر تصور اور معیار کی رو سے دو قومیں ہیں۔ ہم دس کروڑ (مسلمان) ایک طرف ہیں، جو اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، زبان، ادب، طبعی صلاحیتوں اور امنگوں کے اعتبار سے ایک قوم ہیں۔

مختصر یہ کہ زندگی کے متعلق ہمارا ایک امتیازی نظریہ اور تصور ہے، اور قومیت کے ہر بین الاقوامی معیار کی رو سے ہم ایک قوم ہیں''۔

جون ۱۹۴۵ء میں قائداعظم نے فرمایا:

''پاکستان کا منشاء و مقصد صرف آزادی و خود مختاری ہی نہیں بلکہ اسلامی نظریہ ہے جو ایک بیش بہا عطیے و خزانے کی حیثیت سے ہم تک پہنچتا ہے۔ جسے ہمیں قائم و برقرار رکھنا ہے۔ اور جس کی بابت ہمیں توقع ہے کہ دوسرے بھی اس سے متمتع ہوں گے''۔

نومبر ۱۹۴۵ء میں کہا:

''مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ضابطۂ حیات، اپنی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق حکومت کر سکیں۔ ہمارا مذہب، ہمارا کلچر اور ہمارے اسلامی نظریات ہی وہ محرکات ہیں جو ہمیں خود مختاری حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھاتے ہیں''۔

اور صاف الفاظ میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی بات دسمبر ۱۹۴۵ء میں اس طرح کی:

''لیگ اس بات کی دعویدار ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں ایسی مملکت قائم کریں جہاں وہ اسلامی قوانین کے تحت حکومت کر سکیں''۔

کیا کوئی صاحبِ عقل سمجھ سکتا ہے کہ محض تقسیم ملک سے یہ سارے اختلافات اور مسلمانوں کی یہ ساری خصوصیات یک سر ختم ہو گئیں۔ ایک اور آسمانی انقلاب کے ذریعہ وہی قوم چشم زدن میں وطنی قومیت کی علمبردار بن گئی؟ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد قائداعظمؒ نے صاف الفاظ میں کہا:

''پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم دس سال سے کوشاں تھے، بفضلہ تعالیٰ اب ایک زندہ حقیقت ہے۔ لیکن خود اپنی مملکت کا قیام ہمارے مقصد کا صرف ایک ذریعہ تھا اصل

مقصد نہیں تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم ہو جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہیں جس کو ہم اپنے مزاج اور اپنی ثقافت کے مطابق ترقی دیں اور جس میں اسلامی عدل اجتماعی کے اصول آزادی کے ساتھ نافذ و جاری ہوں"۔ (اکتوبر ۱۹۴۷ء)

"صرف یہی نہیں کہ ہم میں سے اکثر مسلمان ہیں، بلکہ ہماری اپنی تاریخ ہے اپنے رسم و رواج ہیں اپنی روایات ہیں، اپنا انداز فکر ہے، اور اپنا ایک مخصوص رجحان ہے جس سے احساسِ قومیت پیدا ہوتا ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ ہم سکون کے ساتھ اپنے انداز پر مستقبل کی صورت گری کریں اور دنیا کے معاملات میں اپنے حق کے مطابق حصہ لیں"۔ (فروری ۱۹۴۸ء)

مارچ ۱۹۴۸ء میں کہا کہ:

"پاکستان مسلم قوم کے اتحاد کا مظہر ہے اور اس کی یہ حیثیت باقی رہنی چاہیے، اور بحیثیت سچے مسلمان کے ہمیں پوری طرح اس اتحاد کی حفاظت کرنی چاہیے اسے قائم و برقرار رکھنا چاہیے"۔

اور فروری ۱۹۴۸ء میں بڑے واشگاف انداز میں میلاد النبی ﷺ کے موقع پر اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا:

"اس اسکیم کو پیش کرنے میں ایک بنیادی اصول میرے پیش نظر تھا۔ یعنی اسلامی جمہوریت کا اصول۔ میرا یہ ایمان ہے کہ ہماری نجات اسی میں مضمر ہے کہ ہم ان بیش بہا اصولوں کی پیروی کریں جو ہمارے عظیم المرتبت قانون دہندہ (Law Giver) پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے وضع کیے تھے۔ آیئے ہم اپنی جمہوریہ کی اساس سچے اسلامی تصورات اور اصولوں پر قائم کریں۔ ہمارے اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنے امور حکومت باہمی مشورے سے طے کیا کریں۔"

یہ تھا قائد اعظم کا تصور پاکستان۔ اور یہی وہ تصور پاکستان ہے جس کی دعوت پر مسلمانوں نے لبیک کہا اور ہر قسم کی قربانی دے کر اس ملک کو حاصل کیا۔ سات سال تک

مسلمانوں نے شب و روز اس مقصد کے لیے کوشش کی۔ ہزاروں انسانوں نے اپنی جانیں اس کی راہ میں نذر کر دیں۔ لاکھوں انسانوں نے گھر بار لٹا دیا اور اپنے وطن تک کو چھوڑ دیا۔ ہزاروں عورتوں نے اس کی قیمت اپنی عصمت کی بربادی کی شکل میں ادا کی۔ اور یہ سب کچھ صرف ایک مقصد کے لیے تھا یعنی اسلامی ریاست کا قیام۔ اسی تصور کو قائد اعظمؒ نے پیش کیا اور آخر وقت تک وہ اسی کے لیے کوشاں رہے۔ قائد اعظمؒ کو لادینی تصور ریاست کا علمبردار قرار دینا اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ اور قائد مرحوم پر سب سے زیادہ شرمناک حملہ اور بہتان ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ عین صبح تقسیم قائد اعظم لادینی ریاست کے ہمنوا ہو گئے تھے وہ قائد اعظمؒ پر بڑے گھناؤنے الزام عائد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا یہ دعویٰ دو ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے یعنی:

(الف) یا تو (خدانخواستہ) قائد اعظمؒ منافق، جھوٹے اور ابن الوقت تھے کہ ایک مہم میں کامیاب ہونے کے لیے مسلمانوں کو دھوکا دیا، ان سے جھوٹے وعدے کیے اور جب اس مقصد میں کامیابی ہو گئی تو پہلے ہی دن، بلکہ ۱۴ اگست کو زمام اقتدار سنبھالنے سے بھی ۳ دن پہلے ہی، اپنے وعدوں سے مکر گئے اور جس اصول کی خاطر اپنی ساری قوت صرف کی تھی کامیابی کی پہلی ہی جھلک پر اسے اپنے ہی ہاتھوں دفن کر دیا۔ اور یہ وہ بات ہے جو قائد اعظمؒ کے بڑے سے بڑے مخالف بھی ان کے متعلق نہیں کہہ سکے۔ اس لیے کہ وہ ایک بااصول انسان تھے اور جو بات وہ زبان سے کہا کرتے تھے وہی ان کے دل میں ہوا کرتی تھی، محض مقصد براری کے لیے انہوں نے کبھی دوسروں کو نہ غلط فہمی میں رکھا اور نہ دھوکا دیا۔

(ب) یا پھر قائد اعظمؒ ذہنی انتشار اور فکری ژولیدگی میں مبتلا تھے، اور متضاد باتیں کہنے کے عادی تھے۔ کبھی لادینیت کی ہمنوائی کرتے تھے اور کبھی اسلامی ریاست کی علمبرداری اور یہ بھی ایک ایسی بات ہے جو قائد اعظمؒ کے دشمن بھی ان کے متعلق نہیں کہہ

سکتے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے آپ کو قائدِ اعظمؒ کا پیرو کہتے ہیں، جو اس جماعت سے وابستگی کا دعویٰ کرتے ہیں جس نے قائدِ اعظمؒ کی قیادت میں پاکستان کی منزل سر کی تھی، لیکن قائدِ اعظمؒ کے افکار کی جو تعبیر وہ پیش کر رہے ہیں اس سے بڑی زیادتی قائد مرحوم کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ یہ لوگ ان کی طرف وہ باتیں منسوب کر رہے ہیں جن سے قائد کی تصویر ہی بگڑ جاتی ہے اور ان کی ساری عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔ اس سے بڑی زیادتی قائدِ اعظمؒ کے ساتھ اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ بُرا خراج ان کو اور کونسا پیش کیا جاسکتا ہے؟ ان کو بدنام کرنے اور ان کی سیرت کو داغدار بنانے کا اس سے کامیاب حربہ اور کونسا ہو سکتا ہے؟ مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کی وقعت و عظمت کو گرانے کا اس سے بدتر طریقہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟ آج قائدِ اعظمؒ کی روح شدید کرب میں مبتلا ہے اور زبان حال سے گویا ہے۔

ع

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ!

لیکن ایک بنیادی سوال ضرور غور طلب ہے۔ یعنی قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کا منشا کیا تھا؟ اس کے متعلق ہماری معروضات یہ ہیں۔

۱۔ وہ تقریر جس فضا میں کی گئی اسے نظر انداز کر کے اسے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اگست ۱۹۴۷ء کا مہینہ شدید کشت وخون کا مہینہ تھا۔ ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہندوستان میں مسلمان خون میں نہلائے جا رہے تھے۔ پاکستان میں بھی ناسمجھ عناصر ہندوؤں کے ظلم کا بدلہ یہاں کے غیر مسلموں سے لے رہے تھے۔ فضا میں تکدر اور بڑا شدید کھچاؤ تھا۔ ایسے موقع پر اعتماد کی فضا کو بحال کرنے کے لیے قائدِ اعظمؒ نے اقلیتوں کو آزادی اور حفاظت کی ضمانت دی اور کہا کہ مذہب کے اختلافات کی بناء پر ان سے کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا اور ان کے جائز حقوق ان کو ہر حالت میں دیے جائیں گے۔ اور یہ بات مخصوص حالات کی بنا پر آپ نے ایک خاص اہمیت کے ساتھ

کہی۔ بلکہ اس خاص پسِ منظر میں مبالغہ ہوتا تو وہ بھی قابلِ فہم ہوتا۔

۲۔ دوسری بڑی بنیادی بات یہ ہے کہ آپ نے ساری اہمیت اس بات کو دی کہ مسلمان، عیسائی اور ہندو برابر کے شہری ہوں گے۔ برابر کے شہری ہونے سے یہ بات ہرگز لازم نہیں آتی کہ ریاست کا کوئی نظریہ نہیں ہوگا یا یہ کہ اسلام کا رہنما اصول نہ ہوگا اور ملک اور اس کا قانون اسلامی قانون نہ ہوگا۔ یہ بات محض ''جدید مفسرین'' کا اضافہ ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے یہ نہیں کہا تھا۔ علمِ سیاست کے طالب علم بھی اس بات سے واقف ہیں کہ شہریت اور چیز ہے اور قومیت اور، نیز غیر مسلموں کے شہریت میں برابر کے شریک ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اکثریت کی آئیڈیالوجی ہی پر خط تنسیخ پھیر دیا جائے گا۔

۳۔ اسی طرح یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ الفاظ ''کاروبار سلطنت'' (Business of the State) کے استعمال ہوئے ہیں، ''نظریہ ریاست'' (Ideology of the State) یا ''اساس سلطنت'' (Basis of State) کے نہیں۔ ''کاروبار سلطنت'' ایک انتظامی تصور ہے۔

اور سیاق وسباق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد ریاست کا ایڈمنسٹریشن ہے نہ کہ اس کا مقصد، نظریہ اور رہنمائی کے اصول۔ اس کی وضاحت ان کے اس جملے سے ہو جاتی ہے کہ ''مذہبی امور دینی معنی میں نہیں، بلکہ صرف سیاسی مفہوم میں ۔یعنی ریاست کے عام شہریوں کی حیثیت سے (ان میں کوئی فرق نہ برتا جائے گا)''۔ اس لیے یہ تقریر ایک غیر متعصبانہ اور متعین معاملہ میں ان کی رائے کے اظہار کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ پھر ایک شخص کے خیالات کو کسی ایک اقتباس سے کبھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی پوری فکر اس کی تمام تصریحات کے پسِ منظر میں ہی سمجھی جا سکتی ہے۔ ان کی اس

تقریر کا اس مجموعی تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو پھر کوئی غلط فہمی نہیں رہتی۔ تعبیر کی گمراہیاں پیدا ہی اس بنا پر ہوتی ہیں کہ صرف ایک پیرا گراف کو مقرر کی عمومی فکر سے کاٹ کر دیکھا جاتا ہے اس طرح (غلط تعبیر) کا رونما ہونا بالکل فطری ہے۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ ایک شخص کی تمام فکر کو سامنے رکھیے اور پھر کوئی نتیجہ نکالیے، اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ حق کا طالب نہیں بلکہ اپنے مخصوص نظریات کی خاطر دوسروں کے خیالات کا استحصال(Exploitation) کرنا چاہتا ہے اور قائداعظمؒ تو بے چارے ایک انسان ہی ہیں، اس مکروہ مقصد کے لیے تو لوگ قرآن پاک تک کو نہیں چھوڑتے ؂

"خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں"

(اپریل ۱۹۹۲ء)

سوات اور مالاکنڈ میں شرعی نظامِ عدل کا نفاذ

سوات میں شرعی نظام عدل ریگولیشن کا اجراء ایک طویل پسِ منظر رکھتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ریاست سوات کے پاکستان میں ادغام کے وقت سواتی عوام سے وعدہ کیا گیا تھا کہ سوات میں پہلے سے جاری شرعی نظام عدل جاری رہے گا تاہم ۴۰ سال گزرنے کے بعد بھی یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے بعد افغانستان میں امریکی مداخلت اور پاکستان کی جانب سے امریکہ کے ساتھ تعاون کے نتیجے میں پورے پاکستان اور بالخصوص وفاق اور خیبر پختونخوا کی صوبائی حکومت کے زیرانتظام قبائلی علاقوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اسی کے اثرات میں سے ایک پہلو یہ تھا کہ ۲۰۰۹ء تک سوات کے ایک بڑے علاقے پر طالبان (ملا فضل اللہ) کے پیروکاروں نے کنٹرول حاصل کر لیا۔ ان لوگوں نے اپنے تئیں شریعت کے نفاذ کی مہم شروع کی۔ جواباً صوبائی حکومت کی رضامندی سے وفاقی حکومت کے حکم پر پاکستان آرمی نے تین بڑے آپریشن کر کے سوات پر حکومت پاکستان کی عملداری کو مستحکم کیا۔

دوسری جانب حکومت نے صوبائی اور مقامی سطح پر مذاکرات کے بعد قومی اسمبلی کی متفقہ قرارداد کی روشنی میں ۱۵ مارچ کو شرعی نظام عدل ریگولیشن ۲۰۰۹ء نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ تاہم عملاً اس کے نفاذ کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔ بعدازاں ۲۰۱۸ء میں ۲۵ ویں آئینی ترمیم کے تحت وفاقی اور صوبائی حکومت کے زیرانتظام قبائلی علاقوں کی صوبہ پختونخواہ میں شمولیت کے سبب پشاور ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ چونکہ ۲۵ ویں آئینی ترمیم میں شرعی نظام عدل ریگولیشن کو تحفظ نہیں دیا گیا اس لیے یہ قانون ختم ہو گیا۔

عوامی بے چینی کے سبب پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے کو صوبائی حکومت نے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ تازہ صورت حال یہ ہے کہ نومبر ۲۰۱۹ء میں سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کے فیصلے کے سلسلے میں صوبائی حکومت کو مناسب قانون سازی کے لیے چھ ماہ کا وقت دیا تھا۔

پروفیسر خورشید احمد نے اپنے اس مضمون میں سوات میں شرعی نظام کے نفاذ کی نہ صرف تاریخ بیان کی ہے بلکہ اس قانون پر کیے گئے اعتراضات کا علمی محاکمہ کیا ہے۔

چشم فلک نے یہ منظر بار بار دیکھا ہے کہ اسلام دشمن قوتیں بڑی چابک دستی سے اہلِ ایمان کے خلاف ایک چال چلتی ہیں اور مطمئن ہوتی ہیں کہ اپنے اہداف حاصل کرنے والی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ایک دوسری ہی تدبیر کا اہتمام فرماتا ہے اور باطل قوتوں کے سارے اندازے اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ان کے شر کے بطن سے خیر کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور جو چیز کسی کے خواب و خیال میں نہ تھی، وہ اہلِ حق کے لیے رونما ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں تاریخ کے اس معجزاتی عمل کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے تاکہ ہر دور میں اہلِ ایمان کی ہمتوں کو مضبوط اور تاریکی سے روشنی کے نمودار ہو جانے کی امیدوں کے چراغ روشن کیے جاسکیں۔ بنی اسرائیل کی چال بازیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ (اٰل عمرٰن ۳: ۵۴)

پھر بنی اسرائیل (مسیحؑ کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے۔ جواب میں اللہ نے اپنی تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔

سورۂ انفال میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ (الانفال ۸: ۳۰)

وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ جب منکرین حق آپ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔

ان تاریخی حقائق کی روشنی میں ذرا ان حالات پر غور کیجیے جو امریکا کی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ، کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خونی یلغار سے دنیا بھر میں اور خصوصیت سے افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں اس جنگ میں جنرل پرویز مشرف

کی شرکت اور خود پاکستان کی فوج کو پاکستان کے عوام کے خلاف صف آرا کر دینے سے رونما ہوئے۔ گزشتہ ۴ سال کی مسلسل فوج کشی اور امریکا کے اب تک ۱۰۰ سے زائد ڈرون حملوں کے باوجود کسی ایک علاقے میں بھی فوجی ایکشن کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر مذاکرات اور سیاسی حل کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ سوات کا علاقہ گذشتہ دو ڈھائی سالوں میں میدانِ کارزار بنا رہا۔ سینکڑوں افراد شہید ہوئے، ہزاروں زخمی ہوئے اور لاکھوں دربدر کی ٹھوکریں کھانے اور مہاجرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔

کسے خیال تھا کہ اس علاقے میں امن کی تلاش میں بالآخر شریعت کے نفاذ کا راستہ اختیار کیا جائے گا اور بش اور مشرف کی برپا کردہ جنگ کا اختتام اور آئندہ کا دروبست ایک ایسی جماعت کے توسط سے ہو گا جو سیکولرازم کی دعوے دار ہے اور ۱۸ فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جس کی کامیابی کو ملک ہی کے نہیں دنیا بھر کے آزاد خیال اور سیکولرازم کے حامی عناصر نے دینی قوتوں کی پسپائی اور سیکولرازم اور آزاد خیالی کی فتح قرار دیا تھا۔ جس قانونی تبدیلی کا مطالبہ علاقے کے عوام ۱۹۶۹ء سے کر رہے تھے اور جس کے لیے کم از کم دو بار قانون سازی آخری مراحل تک پہنچ گئی تھی، اس کی تکمیل اور تنفیذ پیپلز پارٹی اور اے این پی کی صوبائی حکومت اور تحریک نفاذِ شریعت محمدی کی قیادت کی مشترک مساعی سے اور زرداری صاحب کی ۲ ماہ تک ٹال مٹول کے بعد قومی اسمبلی کی متفقہ سفارش سے ہونا تھی۔ سارا سیکولر طبقہ آتش زیر پا ہے اور امریکا اور مغربی ممالک واویلا کر رہے ہیں۔ لیکن جو قانون سیدھے سیدھے عوامی مطالبے اور لوگوں کی خواہش کے نتیجے میں نافذ نہ ہو سکا تھا وہ اس معجزاتی انداز میں اسمبلی کی تائید سے نافذ ہو رہا ہے۔

تاریخ ساز اقدام

سوات کی ریاست برطانوی دور میں پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد معرضِ وجود میں آئی۔ وہاں کا قانون بڑی حد تک شریعت پر مبنی تھا اور اسلامی اصولوں کے مطابق نظامِ قضا کے

ذریعے نافذ تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۹ء تک چلتا رہا جب ریاست کو پاکستان میں مدغم کیا گیا اور عوام سے وعدہ کیا گیا کہ شرعی قانون کو جاری رکھا جائے گا مگر ملک کی سیکولر قیادت نے اس وعدے کے ایفا کے لیے کوئی قابلِ ذکر کوشش نہ کی جس کے نتیجے میں شریعت محمدیؐ کے قیام کا مطالبہ در و دیوار سے برابر کیا جاتا رہا۔ بالآخر وہ حالات پیدا ہوئے جن میں ۱۹۹۴ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت میں (جب سیکولرازم کے علم بردار وکیل جناب اقبال حیدر وزیر قانون تھے اور آفتاب احمد شیر پاؤ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے) ایک مسودہ شرعی نظامِ عدل کے نفاذ کے لیے تیار کیا گیا مگر اس کے نفاذ کی نوبت نہ آئی۔ مطالبہ برابر جاری رہا اور پھر ۹۹۔۱۹۹۸ء میں جناب نواز شریف کے دورِ اقتدار میں سرحد کے وزیر اعلیٰ جناب سردار مہتاب عباسی کی ذاتی دل چسپی سے اس مسودے پر نظرثانی کی گئی اور دینی قوتوں کی مشاورت سے قانون کو ایک واضح شکل دی گئی مگر مشرف صاحب کے 'انقلاب' نے اس سلسلے کو درہم برہم کر دیا۔

یہ صرف قدرت کا کرشمہ ہے کہ ۲۰۰۹ء میں زرداری گیلانی حکومت کے دور میں سرحد کی اے این پی کی حکومت کی مسلسل کوشش اور اس کی اپنی ذمہ داری پر ایک معاہدۂ امن ہوا جس کا مرکزی نکتہ سوات اور مالاکنڈ کے تقریباً تمام علاقوں میں شریعت پر مبنی نظامِ عدل کے قیام کا قانون، حکومت اور علاقے کی دینی قوتوں کے اتفاق رائے سے تیار ہوا اور زرداری صاحب کے سارے تحفظات اور امریکا کی ساری ریشہ دوانیوں کے باوجود بالآخر ۱۳ ۱پریل ۲۰۰۹ء کو قومی اسمبلی کی تائید سے اس کا نفاذ عمل میں آیا۔ یہ تو ابھی دیکھنا ہے کہ فی الحقیقت اس پر کتنی دیانت اور اخلاصِ نیت سے عمل ہوتا ہے لیکن اس قانون پر اتفاق رائے کا رونما ہونا اور پھر دستوری عمل کے مطابق اس کا منظور اور نافذ ہو جانا ایک بہت مبارک اور تاریخی اقدام ہے۔ ہم اس پر ان تمام حضرات کو کھلے دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں جن کا اس سلسلے میں کوئی بھی کردار رہا ہے اور اس توقع کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر اس پر نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ پوری طرح عمل ہوتا ہے تو یہ نہ صرف اس علاقے کی قسمت کو

بدلنے اور امن وانصاف کے قیام کا ذریعہ ہو گا بلکہ پورے ملک کے لیے ایک روشن مثال بھی بن سکے گا۔

اس تناظر میں ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ اس قانون کے ذریعے کیا تبدیلی تجویز کی جارہی ہے اور ملک میں شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں اس میں کون سی نئی راہ اختیار کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ان خطرات کا ادراک بھی ضروری ہے جو اس تجربے کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہو سکتے ہیں، نیز اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس تجربے کو کامیاب کرنے کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ آئندہ سطور میں ہم انھی پہلوؤں کی طرف ضروری اشارات کرنے کی کوشش کریں گے۔

نفاذِ شریعت کا دیرینہ مطالبہ

سیکولر لابی جو بھی گل افشانی کرے، یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ پاکستان کے قیام کا مقصد صرف ایک آزاد ملک کا حصول نہیں تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ آزاد ملک اسلام کی تجربہ گاہ بنے اور اس کے پورے نظامِ زندگی کو قرآن و سنت کی رہنمائی کے مطابق مرتب و منظم کیا جائے۔ اقبال اور قائد اعظم نے برعظیم کے مسلمانوں کو نجات کی جس راہ کی طرف دعوت دی تھی، اس کا مرکزی نکتہ یہی نظریہ تھا اور ہندوستان کے ان مسلمانوں نے جن کا تعلق مسلم اقلیتی صوبوں سے تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پاکستان کا حصہ نہیں ہوں گے، صرف اپنے ایمان اور دین کے تقاضوں کے تحت اس تحریک کی دل و جان سے تائید کی تھی اور اس کی کامیابی کے لیے عظیم قربانیاں پیش کی تھیں۔ پاکستان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نفاذِ شریعت کا مطالبہ آج نہیں کیا جارہا۔ یہ تحریکِ پاکستان کی روح تھا اور آج بھی یہی چیز پاکستان کی بقا اور ترقی کی ضامن ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اقبال، قائد اعظم اور قائد کے دستِ راست لیاقت علی خاں کے ان اعترافات اور وعدوں کو ذہن میں تازہ کرلیں جو پاکستان کے مقصد اور

اس کی اصل حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں اپنے پورے تجزیے کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی تھی کہ: ''اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالم گیر نظامِ سیاست ہے جس کی اساس وحی اور تنزیل پر ہے''۔

اس خطبے میں اقبال نے صاف الفاظ میں کہا تھا:

> اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، عبادت گاہ اور ریاست ایک دوسرے کی فطری تکمیل کرتے ہیں۔

ان کا ارشاد تھا:

> اسلام کا مذہبی نصب العین اُس اجتماعی نظام سے نامیاتی تعلق رکھتا ہے جو وہ قائم کرتا ہے۔ ایک کے مسترد کرنے سے لامحالہ دوسرا بھی مسترد ہو جائے گا۔ اس لیے کسی پالیسی کی قومی سطح پر اس طرح تشکیل کہ اس سے اسلام کے یک جہتی کے اصول اپنی جگہ نہ رہیں، کسی مسلمان کے لیے بالکل ناقابل قبول ہے۔

یہی وجہ ہے کہ برعظیم میں اسلام کی بقا اور فروغ کے لیے ان کی نگاہ میں ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام ناگزیر تھا۔ فرماتے ہیں:

> ملک میں ایک تہذیبی طاقت کی حیثیت سے اسلام کی زندگی بڑی حد تک ایک مخصوص علاقے میں اس کی مرکزیت پر منحصر ہے۔

چنانچہ ان کا مطالبہ تھا:

> اس لیے میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک متحدہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتا ہوں۔

اصل مسئلہ ہی اسلام کا تحفظ اور فروغ تھا۔ اسی لیے علامہ اقبال نے سید غلام بھیک

نیر نگ کے نام اپنے ایک خط میں آزادی کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح فرمایا:

اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظتِ اسلام اس کا عنصر نہیں تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

قائداعظم نے مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کا دعویٰ اسی بنیاد پر کیا:

ہم ایک علیحدہ قوم ہیں، جس کے پاس اپنا خاص تمدن و تہذیب، زبان اور ادب، فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر، نام اور اصطلاحات، اقدار کا تخیل اور تناسب کا تصور، عدالتی قانون اور اخلاق کا ضابطہ، رواج اور سنہ تاریخ اور روایات، رجحانات اور تمنائیں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے متعلق ہم ایک خاص تصور رکھتے ہیں اور بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک علیحدہ قوم ہیں۔ (گاندھی جناح مراسلت)

اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظم نے حیدرآباد دکن میں نوجوان طلبہ کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے اسلامی ریاست کو سیکولر ریاست سے ان الفاظ میں ممتاز و ممیّز قرار دیا:

اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی، قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے بہر حال آپ کو علاقے اور سلطنت کی ضرورت ہے۔ مسلم لیگ کی تنظیم، اس کی جدوجہد، اس کا رُخ اور اس کی راہ، سب اس کے جواب ہیں۔

۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو صوبہ سرحد میں منعقدہ مسلم لیگ کانفرنس میں آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا:

مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں، جہاں وہ خود اپنے ضابطۂ حیات، اپنے تہذیبی ارتقا، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔

اور اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

> [مسلم] لیگ ہندوستان کے ان حصوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کی علم بردار ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ مسلمان وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت کر سکیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد سرحد اور قلات (بلوچستان) دونوں جگہ قائداعظم نے واضح الفاظ میں ان لوگوں کے الزامات کی تردید کی جو کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں قانون سازی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی احکام کے مطابق نہیں ہوگی۔ ان کا ارشاد تھا کہ "یہ بات قطعی طور پر غلط ہے"۔

لیاقت علی خاں نے قرارداد مقاصد کی شکل میں پاکستان کے قیام کے اصل مقاصد کو مرتب اور محفوظ کر دیا۔ ۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو انھوں نے راولپنڈی میں اعلان کیا تھا کہ قائداعظم اور ان کے رفقا کی یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ پاکستان کی نشوونما ایک ایسی مضبوط اور مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہو جو اپنے باشندوں کو عدل وانصاف کی ضمانت دے سکے۔ پھر دسمبر ۱۹۴۹ء میں کوہاٹ میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام میں لیاقت علی خاں نے کہا:

> جہاں تک لوگوں کی اس اُمنگ کا تعلق ہے کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق حکومت ہونی چاہیے، دستور ساز اسمبلی کی منظور کردہ قرارداد مقاصد ان کی کافی ضمانت ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر ہم نے پاکستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی تو پاکستان زندہ نہیں رہ سکے گا۔

عوام کی اس خواہش کا مظہر پاکستان کا دستور ہے جس میں قرارداد مقاصد نہ صرف اس

کا دیباچہ ہے بلکہ دفعہ ۲الف کی شکل میں اس کا ایک قابلِ تنفیذ حصہ ہے۔ دستور میں مرقوم ریاست کی حکمرانی کے بنیادی اصول زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کے قیام کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور دستور کی دفعات ۲۰۳ اور ۲۲۷ پورے قانونی نظام کو شریعت کے تابع اور اس سے ہم آہنگ کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔

شرعی نظامِ عدل ریگولیشن: اہم نکات

سوات اور مالاکنڈ کے عوام قیامِ پاکستان کے مقاصد اور دستورِ پاکستان کے ان ہی تقاضوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے جس کی طرف ایک مؤثر قدم ''عدالتوں کے ذریعے نفاذِ شریعت کے لیے قانون وضع کرنے کا ریگولیشن'' ہے۔ یہ ریگولیشن ایک مثبت اقدام ہے اور اس کے اہم نکات کو سمجھنا اس کی اہمیت کے ادراک کے لیے ضروری ہے۔

اس قانون کی غرض وغایت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ ''مانسہرہ سے ملحقہ قبائلی علاقوں اور سابق ریاست امب (مانسہرہ اور آزاد کشمیر کے مابین علاقہ) کے سوا شمال مغربی سرحدی صوبہ کے زیرانتظام قبائلی علاقوں میں عدالتوں کے ذریعے نظام شریعت کا نفاذ کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا عنوان ''شریعۃ نظام عدل ریگولیشن ۲۰۰۹ء'' ہے۔

اس قانون کی اصل اہمیت اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس طریقے کے علاوہ جو اَب تک پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے اختیار کیا گیا ہے یعنی 'نفاذ اسلام بذریعہ قانون سازی' اب اس کے ساتھ ساتھ 'نفاذِ اسلام بذریعہ نظامِ قضا' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت پانچ سطحوں پر مشتمل جس نظامِ قضا کو قائم کیا جانا پیش نظر ہے وہ ملکی قانون کے طور پر نفاذ کے ساتھ ان تمام امور پر بھی حاوی ہے جو شریعت کے دائرے میں آتے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی متعین قانون موجود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں فقہ کی تدوین کے علی الرغم نفاذِ اسلام کا ایک اہم ترین ذریعہ نظامِ قضا ہی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایت کا اہم سرمایہ ججوں کے بنائے ہوئے قوانین پر مشتمل ہے۔

ریاستی قانون سازی کے ذریعے نفاذِ اسلام کا تجربہ ایک نیا تجربہ تھا اور کم از کم پاکستان کی حد تک اس کے اثرات اور نتائج بہت زیادہ قابلِ فخر نہیں۔ اس پس منظر میں سوات اور مالاکنڈ کے لیے بنایا جانے والا حالیہ قانون ایک اہم تجربے کی طرف پہلا قدم ہے۔ ہمیں تعجب ہے کہ زرداری صاحب اور خود اے این پی کی قیادت نفاذِ شریعت کے پہلوؤں پر پردہ ڈالنے اور نظامِ عدل اور قیامِ امن کے پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو یا ان کی کم علمی کا مظہر ہے یا اس سے بھی زیادہ سنجیدہ اور تباہ کن چیز، یعنی علمی بددیانتی کا۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون کے چند اہم پہلوؤں کو قوم کے سامنے بلاکم و کاست لایا جائے:

۱۔ نفاذِ شریعت اور قیامِ امن کے لیے ایک مربوط اور خود مکتفی نظام وضع کیا گیا ہے جس کی پانچ سطحیں ہیں اور اپیل کے لیے دو ادارے بنائے گئے ہیں:

○ ضلع قاضی کی عدالت ○ اضافی ضلع قاضی کی عدالت ○ اعلیٰ علاقہ قاضی کی عدالت ○ علاقہ قاضی کی عدالت ○ انتظامی مجسٹریٹ کی عدالت اور اپیل اور نگرانی کے لیے دو ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے بنچ کا درجہ رکھیں گے، یعنی ○ دارالقضا ○ دارالدارالقضا۔

۲۔ شریعت کی تعریف ماقبل کی تمام مساعی کے مقابلے میں زیادہ متعین طور پر کی گئی ہے، یعنی شریعت سے اسلام کے احکام مراد ہیں جیسا کہ قرآن اور سنت نبویؐ، اجماع اور قیاس میں بیان کیے گئے ہیں۔ ہمارے علم کی حد تک اجماع اور قیاس کا واضح اضافہ پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔ دستور میں صرف قرآن و سنت کا ذکر ہے اور یہی صورت ۱۹۹۱ء کے نفاذِ شریعہ ایکٹ میں ہے۔ نیز ہماری نگاہ سے اس علاقے کے بارے میں جو مسوداتِ قانون گزرے ہیں یعنی ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۹ء کے مسودے، ان میں اجماع اور قیاس کا ذکر نہیں تھا۔ علمائے کرام دلائلِ شریعہ سے استنباط احکام کی وضاحت کی ضرورت کو بیان کرتے رہے ہیں لیکن یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ اجماع اور قیاس کو بھی تعریف میں شامل کیا گیا ہے۔

۳۔ اس قانون میں خلافِ قرآن و سنت قوانین کی خود بخود قابل عمل نہ رہنے کے بارے میں ایک بہت واضح اعلان ہے جو بہت اہم اقدام ہے۔اس کی دفعہ چار میں وضاحت موجود ہے کہ اس ریگولیشن کے نفاذ سے پہلے اس مذکورہ علاقے میں قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ سے متصادم کوئی بھی نافذ العمل قانون، دستاویز، رواج یا دستور یا کوئی بھی ایسی صورت، اس ریگولیشن کے آغازِ نفاذ سے کالعدم متصور ہو گی۔

۴۔ شریعت کو بالاتر قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ عدالتوں کو واضح ہدایت دی گئی ہے کہ فیصلے صرف شریعت کے مطابق کیے جائیں گے۔ ملاحظہ ہو، دفعہ ۹ جس میں واضح کیا گیا ہے:

کہ قاضی یا انتظامی مجسٹریٹ مقدمات چلانے اور ان کے تصفیے کے لیے طریق کار اور کارروائی کی غرض سے قرآن مجید، سنت نبویؐ، اجماع اور قیاس سے رہنمائی حاصل کرے گا اور ان کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرے گا۔ قاضی اور انتظامی مجسٹریٹ قرآن مجید اور سنت رسولؐ کے بیان اور تشریح کے مسلّمہ اصولوں کی پیروی کرے گا اور اس مقصد کے لیے اسلام کے مستند فقہا کے بیانات اور آرا کو بھی مدنظر رکھے گا۔

انتظامی مجسٹریٹ بھی دفعہ ۷ کے تحت 'اپنے فرائض اور ذمہ داریاں' شریعت کے مسلّمہ اصولوں اور مذکورہ علاقے میں فی الوقت نافذ العمل دیگر قوانین کے مطابق انجام دیں گے۔

۵۔ مصالحت کا ایک نظام تجویز کیا گیا ہے جو بڑا مفید اضافہ ہے اور مقدمات اور تنازعات کو جلد نمٹانے کے لیے ایک کارگر نسخہ ہے جسے آج مغربی دنیا میں بھی 'متبادل انصاف' کے عنوان سے اپنایا جا رہا ہے۔ اس میدان میں بھی شریعت سے مطابقت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ نیز اعلیٰ عدالت کو شریعت سے عدمِ مطابقت کی صورت میں مصلح یا مصلحین کے تصفیے پر نظر ثانی یا تنسیخ کا اختیار دیا گیا ہے۔

۶۔ اس قانون میں دستور کی دفعہ ۲۲۷ کی طرح شخصی معاملات کے سلسلے میں ہر مکتب فکر کے پیروکاروں کے لیے ان کے اپنے مسلک کے مطابق معاملات کے طے کیے جانے کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس طرح جو تنوع مسلم معاشرے میں پایا جاتا ہے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۷۔ غیر مسلموں کو ان کے شخصی قانون کے سلسلے میں یہ حق دیا گیا ہے کہ ان کے مقدمات ان کے اپنے متعلقہ پرسنل لا کے مطابق چلائے جائیں گے اور ان کا فیصلہ اس کے مطابق کیا جائے گا۔ شریعت نے جو آزادی غیر مسلموں کو دی ہے، اس کا اس قانون میں پورا اہتمام کیا گیا ہے۔

۸۔ وکلا اور معاونین عدالت کے سلسلے میں واضح بیان اس قانون میں نہیں لیکن اس کے خلاف بھی کوئی بندش موجود نہیں۔ بلکہ دفعہ ۱۵ میں عدالتوں کی امداد و تعاون کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس میں مقدمات میں وکلا یا دوسرے معاونین کی خدمات کے لیے گنجائش موجود ہے۔

۹۔ عدالت کی زبان کے باب میں بھی پہلی مرتبہ اُردو اور انگریزی کے ساتھ پشتو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی ۱۹۹۹ء کے مسودے پر ایک اضافہ ہے۔

۱۰۔ مقدمات کے جلدی فیصلے کے لیے متعدد دفعات میں ضروری قواعد و ضوابط اور ہدایات موجود ہیں اور تاخیری حربے استعمال کرنے پر تعزیرات بھی لاگو کی گئی ہیں۔ نیز دیوانی مقدمات کے لیے زیادہ سے زیادہ ۶ ماہ اور فوجداری کے لیے ۴ ماہ کی مدت متعین کی گئی ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو جلد انصاف میسر آسکے گا۔

۱۱۔ اس قانون کا ایک اور بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے پاکستان کے ۹۴ قوانین کا اطلاق اس علاقے پر کیا گیا ہے اور اس طرح جہاں اس علاقے میں شریعت کے نفاذ کا اہتمام کیا گیا ہے وہیں ان قوانین کی توسیع کے ذریعے اس علاقے کے قانون اور

معاملات کو پاکستان کے باقی نظام سے ایک حد تک ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان قوانین میں بہت سے وہ قوانین بھی شامل ہیں جن کے ذریعے اس علاقے میں باقاعدہ سیاسی سرگرمیاں شروع ہو سکیں گی اور سیاسی پارٹیوں کا ایکٹ نافذ العمل ہو جائے گا۔

متذکرہ بالا گیارہ پہلو ایسے ہیں جو اس قانون کو غیر معمولی اہمیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔

اعتراضات کا جائزہ

اس قانون پر جو اعتراضات کیے جارہے ہیں ان کے تین پہلو ہیں:

اعتراضات کی ایک قسم وہ ہے جو ان حضرات، اداروں اور حکومتوں کی طرف سے آرہے ہیں جو شریعت ہی کے خلاف ہیں اور شریعت کے نفاذ کو اپنے زعم میں حقوقِ انسانی کے خلاف اور جنس کی بنیاد پر امتیاز (Gender discrimination) کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ ان کی مخالفت اس قانون سے نہیں، خود شریعت سے ہے۔ ان کو ہمارا جواب یہ ہے شریعت مسلمانوں کے لیے کوئی بیرونی شے یا باہر سے، یا جبر سے مسلط کی جانے والی چیز نہیں ہے بلکہ ہمارے ایمان کا تقاضا اور ہماری آرزوؤں اور اُمنگوں کی تکمیل ہے۔

دنیا بھر میں مسلمانوں کے بارے میں کیے گئے رائے عامہ کے سروے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ساری خرابیوں کے باوجود ۹۰ فی صد سے زیادہ مسلمان اسلام ہی کو اپنی شناخت قرار دیتے ہیں اور مسلمان مرد اور خواتین، بوڑھے اور جوان بلا تفریق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی صورت گری اسلام کے اصولوں اور احکام کے مطابق چاہتے ہیں۔ پاکستان کے اور مسلم دنیا کے ۲۷ ممالک کے مسلمانوں کی اکثریت شریعت کو قانون کا واحد سرچشمہ (Only source of law) قرار دیتی ہے۔ اگر اس میں ان افراد کو شامل کر لیا جائے جو شریعت کو 'ایک سرچشمہٴ قانون' (One source of law) کہتے ہیں تو یہ تعداد ۸۰ سے ۹۰ فی صد

تک پہنچ جاتی ہے۔[1] جو حضرات اپنے کو آزادی کا پرستار اور جمہوریت پسند کہتے ہیں ان کو اتنا تو تسلیم کرنا چاہیے کہ اگر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اپنی آزاد مرضی اور قلبی اطمینان کے ساتھ اپنے معاملات کو شریعت کے مطابق دیکھنا چاہتی ہے تو اس ۱۰ فی صد لبرل اقلیت کو کیا حق ہے کہ ان پر اپنی رائے مسلط کرے اور مغرب کی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والی حکومتوں کو کیا حق ہے کہ وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی خواہشات اور عزائم کو یک طرفہ طور پر رد (ویٹو) کریں۔ یہ فسطائی ذہنیت ہے، اس کا جمہوریت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔

بلاشبہ جمہور مسلمین کے دل کی آواز شریعت کا نفاذ ہے۔ جو جمہوریت کے دعوے دار ہیں انھیں صرف جمہور کی خواہش اور ارادے کا احترام کرنا چاہیے لیکن جہاں تک معاملہ مسلمانوں کا ہے، تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ مسلمان نام ہی اس مرد یا عورت کا ہے جو اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے تابع کرتا ہے اور اپنی زندگی کو اس قانون کے مطابق ڈھالتا ہے جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ قرآن کا فیصلہ بہت صاف اور واضح ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ... وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (المائدہ ۵: ۴۴، ۴۵، 47)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں... اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں... وہی فاسق ہیں۔

اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی ہدایت ہے جو پوری اُمت کے لیے سنتِ رسولؐ

---

1 ملاحظہ ہو، گیلپ کے عالم گیر سروے۔ مشہور امریکی مصنف جان اسپوزیٹو کی کتاب Who Speaks for Islam? (۲۰۰۷ء) گیلپ کے ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۶ء تک کے سروے پر مشتمل ہے۔ اس میں ساری معلومات کو بڑے سائنسی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی اشاعت امریکا میں گیلپ نے خود کی ہے۔

ہے کہ:

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ (المائدہ ۵:۴۹)

پس اے نبیؐ، تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اور یہ بات بھی اچھی طرح ذہن میں رہنی چاہیے کہ شریعت اور انصاف ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ شریعت کے بغیر انصاف ممکن نہیں اور انصاف کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب شریعت حکم ہو۔ شریعت اور انصاف کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيۡزٌ (الحدید ۵۷:۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اُتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔

نبی پاکؐ کو مخاطب کرتے ہوئے (اُن کی وساطت سے) اللہ تعالیٰ نے پوری اُمت کے سامنے اپنے قانون اور عدل کے رشتے کو اس طرح واضح فرمایا:

فَلِذٰلِكَ فَادۡعُ ۚ وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ ۚ وَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمۡ ؕ (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

اس لیے اے محمدؐ! اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو اور جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ

کرواور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔

قرآن اس مضمون سے بھرا پڑا ہے اور اس سلسلے میں کسی مسلمان کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ حقیقی اسلامی زندگی اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا انحصار شریعت کے مطابق اور شریعت کے ذریعے انصاف کے قیام پر ہے۔ اس سلسلے میں چھوٹا ہو یا بڑا، جو اقدام بھی کیا جائے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کو پورا کرنے اور دینِ حق کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ذریعہ ہو۔

اعتراضات کی دوسری کھیپ کا تعلق اس مفروضے سے ہے کہ ایک ملک میں ایک سے زیادہ قانونی نظام نہیں چل سکتے۔ یہ قانون ایک متوازی نظام قانون مسلط کرنے کی کوشش ہے جو قابلِ قبول نہیں۔

ہم اس اعتراض کو اس لیے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ جس مفروضے پر اس کی بنیاد ہے وہ صحیح نہیں۔ پاکستان میں ایک دستور ہے جو پورے ملک پر حاوی ہے۔ اس دستور میں اس علاقے کے لیے قانون اور قانون سازی کا ایک مختلف طریقہ موجود ہے۔ انگریز کے زمانے میں یہاں کا قانون، باقی ملک سے مختلف تھا اور اس پر کسی کو تناقض اور دو نظاموں کے ٹکراؤ کا خیال نہیں آیا۔ شریعت پر مبنی نظامِ قضا خواہ جزوی شکل ہی میں تھا مگر برطانوی دور میں ایک نہیں متعدد ریاستوں اور علاقوں میں موجود تھا اور اسے معتبر تصور کیا گیا۔ خود پاکستان بننے کے بعد سوات اور قلات میں ایک عرصے تک قضا کا نظام شرعی بنیادوں پر کام کرتا رہا اور کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا بلکہ لوگ خوش اور مطمئن تھے۔ آج بھی آزاد کشمیر میں قاضیوں کا نظام موجود ہے اور وہ عدالتی نظام کے حصے کے طور پر کام کر رہے ہیں اور کہیں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ حد تو یہ ہے کہ آج تک قبائلی علاقے میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (FCR) جیسا جنگل کا قانون موجود رہا اور دُہرے نظامِ عدل کا واویلا نہیں کیا گیا۔ پھر اب یہ آہ و بکا کیوں ہے؟ کیا صرف شریعت کی وجہ سے یہ آوازیں اٹھائی جا رہی ہیں؟

برطانیہ کے عدالتی نظام کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو وہاں کئی سو سال تک Common law courtsاور Equity courtsشانہ بشانہ کام کرتی رہی ہیں۔ امریکا ایک فیڈریشن ہے اور اس کی مختلف ریاستوں میں آج بھی دیوانی اور فوجداری دونوں دائروں میں مختلف قوانین کی عمل داری ہے اور علاقائی حالات، رسم و رواج اور تہذیبی اور ثقافتی فرق کی بنیاد پر قوانین میں فرق بلکہ تضاد تک ہے، حتیٰ کہ امریکا کی نصف ریاستوں میں سزائے موت رائج ہے، جب کہ بقیہ نصف میں اسے ختم کر دیا گیا ہے۔

یہ تو صرف قانون میں تنوع کا مسئلہ ہے۔ چین نے تو ایک ملک اور دو نظاموں کی کامیاب مثال قائم کی ہے اور چین اور ہانگ کانگ میں دو طرح کے نظام اور دو قسم کے قوانین لاگو ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان اعتراضات کی وجہ قانون میں تنوع نہیں، شریعت سے مخاصمت ہے۔ اگر ان حضرات کو ایک نظامِ قانون کی اتنی ہی فکر ہے تو اس پر غور کیوں نہ کیا جائے کہ پورے ملک میں شریعت کے قانون کو یکساں طور پر نافذ کیا جائے۔ آخر دستور تو پاکستان کو اسلامی ری پبلک قرار دیتا ہے، اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیتا ہے اور دفعہ ۲۲۷ کے تحت پورے قانونی نظام کو شریعت سے ہم آہنگ کرنے کا تصور دیتا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے ۴ ہزار سے زیادہ قوانین کا جائزہ لے کر ان کو شریعت سے ہم آہنگ کرنے کی سفارشات مرتب کر لی ہیں۔ پھر انتظار کس بات کا ہے؟ ہم بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ عوام کے جذبات اور مطالبات کا احترام کرتے ہوئے پورے ملک میں شریعت کی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ سوات میں اس نظام کی کامیابی سے پورے ملک کو اس تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع اور تحریک ملے گی۔

عملی مشکلات

تحفظات کا تیسرا حصہ ان امور سے متعلق ہے جو اس قانون کے کامیابی سے نافذ ہونے

کی راہ کی مشکلات کی نشان دہی پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں ہم چند ضروری گزارشات کرنا چاہتے ہیں:

پہلی چیز کا تعلق نیت اور ارادے سے ہے، بلاشبہ ان علاقوں کے عوام دل کی گہرائیوں سے اس نظام کو چاہتے ہیں اور اس سے بڑی توقعات رکھتے ہیں لیکن ہمیں بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی حکومت کے ذمہ دار ترین افراد نہ صرف بددلی کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ بددیانتی کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ شریعت کے پہلو کو یا تو دبایا جاتا ہے یا اسے کم کر کے بتایا جا رہا ہے، جب کہ علاقہ کے عوام کی نگاہ میں اگر کسی چیز میں کشش ہے تو وہ شریعت میں ہے۔ جناب زرداری صاحب اور جناب اسفندیار ولی علی الاعلان بار بار کہہ چکے ہیں کہ یہ نظام عدل سے متعلق ہے حالانکہ اس قانون کی امتیازی حیثیت ہی یہ ہے کہ یہ شریعت پر مبنی نظامِ عدل کا قیام چاہتا ہے، محض عدل کا نہیں۔ پھر امن کے قیام کے پہلو کو شرط بتایا جا رہا ہے، جب کہ اس قانون کی روح کے مطابق اس کے نفاذ کا فطری نتیجہ 'امن' ہوگا۔ اس لیے یہ مشروط نہیں ہے۔

دوسری چیز بیرونی دباؤ اور سازشیں ہیں جو پورے زور و شور سے کارفرما ہیں۔ یہ ہمارے معاملات میں مداخلت ہے اور ہمیں خطرہ ہے کہ جس طرح ہماری حکومتیں سیاسی اور معاشی معاملات میں بیرونی دباؤ کا شکار ہو کر بڑی طاقتوں کی بلیک میلنگ کے آگے سپر ڈال رہی ہیں، اسی طرح شریعت کے معاملے میں بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتی نظر آرہی ہیں۔ ہمیں خطرہ ہے کہ اگر یہ ریشہ دوانیاں راہ پاتی ہیں تو اس قانون پر عمل درآمد متاثر ہوگا جس کے بڑے خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کسی دباؤ میں نہ آئے اور اس قانون اور اس کے پیچھے کیے جانے والے معاہدے پر دیانت اور خلوص سے عمل کرے۔

اگر قومی اسمبلی نے اس قانون کی متفقہ طور پر سفارش کی ہے تو حکومت کو پارلیمنٹ کی اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ ایم کیو ایم نے اس سلسلے میں جو ڈراما رچایا ہے وہ ناقابلِ فہم

ہے۔[1] پارلیمنٹ کی کمیٹی برائے قومی سلامتی نے بھی اس مسئلے پر اپنی متفقہ رائے دی ہے اور ایم کیو ایم کے نمائندے نے ان متفقہ سفارشات کی تائید کی ہے۔ ہم اس سلسلے میں کمیٹی کی سفارشات کو پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ عوام ان لوگوں کی سیاسی بازی گری کو بے حجاب دیکھ سکیں۔ کمیٹی نے پارلیمنٹ کی قرارداد کے نکتہ نمبر ۱۱ پر اپنی سفارشات میں یہ بھی کہا ہے:

حکومت کو سوات میں امن حاصل کرنے کے لیے این ڈبلیو ایف پی (اب خیبر پختونخوا) کی صوبائی حکومت کے ذریعے درج ذیل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے:

(الف) فوج کو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں سے تبدیل کر دیا جائے اور جدید ترین رسل و رسائل اور دیگر آلات کی ضروریات پوری کر کے ان کی صلاحیت کو بڑھایا جائے۔

(ب) حالیہ امن معاہدے کے مطابق وفاقی حکومت/صدر، دونوں کو مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذِ عدل ضوابط کو اپنے مفہوم اور روح کے مطابق فی الفور منظوری دینا اور نافذ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد حکومت کو سوات میں دیرپا امن حاصل کرنے کے لیے پیش قدمی کرتے ہوئے ایک مکالمے پر عمل شروع کرنا چاہیے۔

سیاسی قیادت کے صحیح رویے اور مخلصانہ تعاون اور بیرونی دباؤ اور مخصوص مفادات کے لیے کام کرنے والے عناصر کی کارگزاریوں کے مقابلے کے ساتھ جو کام حکومت اور تمام دینی اور سیاسی قوتوں کو کرنا چاہیے وہ ایسے قاضی حضرات کا تقرر ہے جو علم و تقویٰ کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کے حامل ہوں اور ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس قانون کی کامیابی کا انحصار اس قانون پر عمل کرنے اور کرانے والے افراد کے خلوص، دیانت اور صلاحیت پر ہوگا اور یہ بڑا کٹھن اور فیصلہ کن امر ہے۔ اس لیے جزوی اور غیر متعلقہ بحثوں اور کارروائیوں سے بچتے ہوئے اس نظام کی صحیح بنیادوں پر تشکیل اور اس کی تقویت کو اولین

---

[1] ایم کیو ایم کے لیڈر ڈاکٹر فاروق ستار نے کہا کہ اس ریگولیشن پر غور کرنے کے لیے مزید وقت دینے کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہم اس قرارداد کی حمایت یا مخالفت کرنے کی پوزیشن میں نہیں، اس لیے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

ہماری نگاہ میں ایک مبہم امر اس نظام کی اپیل کی اعلیٰ عدالتیں ہیں۔ جس شکل میں دار القضا اور دار الدار القضا کو اس قانون میں رکھا گیا ہے وہ نظام کی کامیابی کے لیے ضروری ہے لیکن اس کے لیے دستور کے تقاضوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ ۱۹۹۹ء کے قانون میں وفاقی شرعی عدالت کو اپیل سننے کا اختیار دینے کی تجویز تھی جسے اب تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے اختیارات ان نئی عدالتوں کو دینے کے لیے کیا اس قانون سے زیادہ کسی مزید دفعہ کی ضرورت ہے۔ کیا ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے قوانین میں اس کے لیے ترامیم کرنا ہوں گی یا اس کے لیے دستوری ترمیم کی ضرورت ہو گی۔ اس پہلو پر ہمدردانہ غور کرنے اور راہ نکالنے کی ضرورت ہے۔

پھر ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ شریعت کے نفاذ کا عمل صرف قضا کے ذریعے مکمل نہیں ہو سکتا۔ قضا کا حصہ بڑا اہم ہے لیکن وہ ایک حصہ ہے، پورا عمل نہیں۔ اس کے لیے تعلیم، ذرائع ابلاغ، حکومت، انتظامیہ، سیاسی جماعتوں اور دینی قوتوں سب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور سب مل کر ہی شریعت کے قیام کی راہ استوار کر سکتے ہیں۔ شریعت کا تعلق نظامِ عقائد و عبادات سے ہی نہیں، زندگی کے ہر شعبے سے ہے۔

شریعت کا ایک بڑا حصہ خود عمل کرنے کے لیے ہے۔ دوسرے حصے کے نفاذ کا انحصار خاندان، تعلیم اور معاشرے پر ہے۔ ایک تیسرے حصے کا تعلق حکومت کی پالیسیوں سے ہے، اور پھر ایک اہم حصے کا تعلق قانون اور نظامِ قضا سے ہے۔ شریعت کا نفاذ ان سب پہلوؤں پر بہ یک وقت کام اور ان کے درمیان ربط اور ہم آہنگی سے ممکن ہے۔ ان میں سے کوئی بھی تنہا مطلوبہ نتائج نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے کلّی اور ضمنیات پر مبنی جامع حکمت عملی کی ضرورت ہے۔

ہماری خواہش اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعا ہے کہ حکومت، عوام، انتظامیہ اور

سیاسی اور دینی قوتیں سب شریعت کے نفاذ کی کوشش میں اپنا اپنا کردار ادا کریں اور اس تجربے کی کامیابی کے لیے دل و جان سے مصروف ہو جائیں۔ پھر اللہ کی تائید بھی حاصل ہو گی اور تمام مساعی میں برکت کی کیفیت بھی رونما ہو گی۔

ذاتی اور گروہی مفادات اور سیاسی اور جماعتی مصالح سے بالا ہو کر اس قانون اور اس پروگرام کو کامیاب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں عوام کی شرکت اور تعاون بھی ازبس ضروری ہے۔ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد ہم سب ایک بہت بڑے امتحان میں داخل ہو گئے ہیں اور اگر ہم اِس امتحان میں پورے اُترتے ہیں تو دنیا میں بھی اس کے دُور رس اثرات ہوں گے اور آخرت میں بھی نجات ہمارا مقدر بنے گی۔ کامیابی کے حصول کے سوا ہمارے لیے کوئی راستہ نہیں۔ اس لیے ہم سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ ایک دوسرے پر الزامات کی لعنت سے نجات پا کر پُرخلوص جدوجہد اور افہام و تفہیم کے ذریعے شریعت کے سائے میں حقیقی عدل و انصاف کے قیام کے لیے سرگرم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

(مئی ۲۰۰۹ء)

حصہ سوم

مدینہ کی اسلامی ریاست

1. تبدیلی کی سمت اور منزل.... مدینہ کی اسلامی فلاحی ریاست
2. مدینہ کی ریاست، حکومت کے لیے رہنمائی

تبدیلی کی سمت اور منزل.... مدینہ کی اسلامی فلاحی ریاست

تبدیلی قدرت کا قانون ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ترقی اور تشکیلِ نو کا عمل اُمید اور تبدیلی کی جدوجہد ہی سے عبارت ہے، لیکن تبدیلی برائے تبدیلی سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تبدیلی خیر اور فلاح کا باعث صرف اس وقت ہوتی ہے جب اس کی سمت اور منزل کا صحیح صحیح تعین کیا جائے اور بروقت ساری توجہ اصل مقصد کے حصول پر مرکوز کی جائے۔ اگر یہ نہ ہو تو صرف چہرے بدلنے سے حالات میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی کا عمل ترقی کے بجائے تنزل اور مزید بگاڑ پر منتج ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ پچھلے چند برسوں میں پاکستان اور امریکا دونوں میں ہوا ہے۔ قوم مشرف کے آمرانہ اور نظریاتی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے تباہ کن دَور سے نجات چاہتی تھی، اور فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں اس نے مشرف اور اس کے ساتھیوں کو اُٹھا پھینکا اور تبدیلی کی اُمید دلانے والوں کو منصب اقتدار سے نوازا۔ لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''۔ پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کی حکومت نے پرویز مشرف ہی کی پالیسیوں کو مزید بگاڑ کے ساتھ جاری رکھا۔ امریکا کی غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ معیشت کی چولیں ہلا دیں اور اپنے چار سالہ دورِ حکمرانی میں پاکستان کو بیک وقت تین تباہ کن بحرانوں ۱۔ خراب حکمرانی ۲۔ نااہلیت اور ۳۔ بدعنوانی (کرپشن) کی دلدل میں دھکیل دیا۔

قوم آج پھر تبدیلی کی بات کر رہی ہے اور سیاسی فضا میں ہر سمت سے اس کا شور بلند ہو رہا ہے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں ٹھہر کر صورتحال کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ تبدیلی، ایک اور دھوکا اور سراب نہ بن جائے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب ٹھیک ٹھیک اس امر کا تعین کر لیا جائے کہ کون سی تبدیلی مطلوب ہے۔ اس کی سمت، منزلِ مقصود اور نقشۂ

کا رطے کرنا اولین ضرورت ہے۔

دوسری جانب ایک تازہ مثال خود امریکا کی ہے۔ اوباما صاحب تبدیلی کے نعرے پر برسرِاقتدار آئے تھے اور امریکا کے تمام ہی رائے عامہ کے جائزے یہ خبر دے رہے تھے کہ امریکی عوام بش کے دور کی پالیسیوں سے نالاں ہیں اور سیاسی زندگی میں ایک نیا ورق پلٹنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن پہلے ہی سال میں ان کے سارے بلند بانگ دعووں کے باوجود یہ بات واضح ہو گئی کہ اوباما صاحب بھی اسی طرح امریکی مقتدرہ (Establishment) اور مقتدر اداروں اور مخصوص مقاصد پیش نظر رکھنے والے گروہوں کے اسیر ہیں جس طرح ان کا پیش رو جارج ڈبلیو بش تھا۔ چنانچہ اس کے اقتدار کے اب تک کے تین سال کسی تبدیلی کے نہیں بلکہ تسلسل اور بگاڑ میں اضافے اور ملکی اور بین الاقوامی دونوں محاذوں پر امریکا کی ناکامی کے سال ثابت ہوئے ہیں۔

ان دونوں مثالوں کی روشنی میں اس امر کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے کہ پاکستان کے عوام ۲۰۱۲ء میں اپنے مستقبل کی خاطر جس تبدیلی کے لیے سرگرمِ عمل ہیں، اس کے خدوخال اس جدوجہد کے آغاز ہی میں بالکل واضح ہونے چاہییں، اور قوم سیاسی قیادت کو اس کسوٹی پر پرکھے جس سے معلوم ہو سکے کہ مطلوبہ تبدیلی کے لیے کس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور وہ کون سے کھوٹے سکے ہیں جن سے نجات مطلوب و مقصود ہے۔

ہم نے اس سلسلے میں اپنا نہایت واضح اور مفصل منشور سال کے آغاز ہی میں قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے اور اس میں تبدیلی کے لیے جس نمونے کا تعین کیا ہے وہ مدینہ کی اسلامی فلاحی ریاست ہے جس کی صورت گری خود حضور اکرم ﷺ اور آپؐ کے خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہوئی اور جس نے تاریخ انسانی کے رُخ کو موڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمانے کے اور پوری دنیا کے مسلمانوں کی دلی خواہش ہے کہ ان کا اجتماعی نظام خلافتِ راشدہ کے نمونے پر قائم ہو۔ وہ خلفائے اربعہ کے دور کو تاریخِ انسانی کا مثالی دور سمجھتے ہیں اور ماضی میں بھی برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس نمونے کو رنگ و بو کی

دنیا میں دوبارہ زندہ و قائم کریں۔ اُمت مسلمہ کے قلب و نظر کو کبھی کسی ایسی تحریک نے اپیل نہیں کیا، جو خلافتِ راشدہ کے مقابلے میں کوئی دوسرا معیار اور نمونہ پیش کرے۔ دوست اور دشمن سب اس بات کے معترف ہیں کہ اسلام کا وہ مثالی دور ہی ہمیشہ مسلمانوں کی توجہ کا مرکز اور ان کا حقیقی مطلوب و مقصود رہا ہے اور اس کے احیا کے لیے مسلمان ہر زمانے اور ہر ملک میں جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان کی پکار ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ؏

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

یہ اعلان مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کا پیامبر ہے اور ان کے حقیقی جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہے۔ مسلمان دل سے چاہتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے دور کا احیا ہو اور ان کی یہ خواہش اس لیے ہے کہ وہ دور انسانی تاریخ کا بہترین دور تھا۔ نیز خود نبی اکرم ﷺ نے اس دور کو آنے والوں کے لیے معیاری دور قرار دیا ہے اور اس کے اتباع کی دعوت دی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: ''پس تمہارا فرض ہے کہ میری سنت کو اختیار کرو اور اس پر مضبوطی سے جمے رہو اور اس کو دانتوں سے پکڑ لو۔ خبردار! ان باتوں کے قریب نہ پھٹکنا جو میرے طریقے اور اصحاب کے طریقے سے ہٹ کر نئی ایجاد کر لی جائیں''۔

حضورؐ کا یہی ارشاد ہے جس کی تعمیل میں مسلمان ہمیشہ احیائے خلافت راشدہ کی جدوجہد کرتے رہے ہیں اور آج بھی ملتِ اسلامیہ کے سامنے یہی نصب العین ہے لیکن خلافتِ راشدہ کے احیا کے معنی کسی خاص دورِ تاریخ کو اپنے تمام جزوی مظاہر اور تکنیک کے ساتھ دوبارہ زندہ کرنا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کے جو اصول، اقدار اور ضابطے اس زمانے میں اختیار کیے گئے، ان ہی کو از سرِ نو قائم کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ اصول ابدی صداقت رکھتے ہیں اور ہر دور اور ہر زمانے میں معاشرے کی قلب ماہیت اسی طریقے پر کر سکتے ہیں جس پر اس سے پہلے حضور اکرم ﷺ اور خلفائے اربعہ کے زمانے میں کر چکے ہیں۔ خلافت راشدہ کے قیام کے معنی انہی اصولوں کا قیام ہے۔

خلافت راشدہ کے قیام کی بنیادیں

سوال یہ ہے کہ وہ اصول کون سے ہیں؟ خلافتِ راشدہ کے قیام کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس دورِ تاریخ کی خصوصیات کیا کیا ہیں؟ اس لیے کہ اگر ہم خلافتِ راشدہ کا احیا چاہتے ہیں تو ہمیں انھی اصولوں، انہی بنیادوں اور انہی اجتماعی خصوصیات کا احیا کرنا ہوگا۔

دستوری حکومت: خلافتِ راشدہ کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ اس کا نظامِ حکومت شخصی نہیں، دستوری تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کے تمام معلوم سیاسی نظام بادشاہی کی بنیاد پر قائم تھے یا شخصی آمریت کی بنیاد پر۔ آپ ﷺ نے جو نظامِ حکومت قائم کیا وہ شخصی بنیاد کے بجائے قانون کی بالادستی اور ایک معین دستور کی حکومت کی اساس پر تھا۔ اس میں نہ شہنشاہیت کی گنجائش تھی اور نہ آمریت کی، نہ خاندان پرستی تھی اور نہ شخصیت پرستی کی۔ حاکمیت کے اصل اختیارات اللہ تعالیٰ کو حاصل تھے اور اس کا عطا کردہ، قانون مملکت کا قانون تھا۔ امیر اور غریب اور اپنے اور پرائے سب اس قانون کے تابع تھے اور کوئی اس سے سرمو انحراف نہ کرسکتا تھا۔ یہی چیز ہے جس کا اظہار حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا ہے: ”لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ تم لوگوں میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں فلاح و بہبود کے کام کروں تو میری امداد کرنا ورنہ اصلاح کردینا۔ میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرنا لیکن خدا اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے“۔

پھر حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کو روانہ کرتے ہوئے آپؓ نے فرمایا: ”میرا مقام صرف متبع کا ہے، میں بہرحال کوئی نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ پس اگر نبی ﷺ کی راہ پر استوار ہوں تو میری پیروی کرنا اور اگر اس راہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے راہِ راست پر لے آنا“۔

یہاں دستوری حکومت کا نقشہ پیش کیا جارہا ہے۔ امیر جو کچھ چاہے وہ کرنے کے لیے آزاد نہیں ہے۔ وہ خود ایک قانون کا پابند ہے اور اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ اس قانون

کو نافذ کرے۔ یہی قانون خود اس کے اُوپر بھی قائم ہوتا ہے اور یہی تمام مسلمانوں پر بھی۔ وہ لوگوں پر اپنی مرضی تھوپنے کا حق دار نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے: ''ایک حاکم کو سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ لوگوں کے اندر جو چیز دیکھنی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو حقوق و فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو وہ ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارا فرض صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو جس اطاعت کا حکم دیا ہے اس کا حکم دیں، اور جس نافرمانی سے روکا ہے اس سے روکیں''۔

امیر اپنی ذات میں مطاع نہیں ہوتا۔ اس کی اطاعت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ شریعت کو قائم کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے کہ اطاعت صرف معروف میں ہے منکر میں نہیں، اور یہ اصول شخصی حکومت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ (المائدہ ۵:۲)

معاونت کرو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں اور تعاون نہ کرو گناہ اور برائی کے کاموں میں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اسلامی حکومت کے اصحاب امر کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ وہ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔ اور جب خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔

پھر امیر اس قانون کو صرف اوروں ہی پر نافذ نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر بھی نافذ کرتا ہے اور خود بھی اس کی اس طرح اطاعت کرتا ہے جس طرح کہ دوسروں سے کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس بات کو اس طرح بیان فرمایا ہے: ''میں ایک عام مسلمان اور ایک

کمزور بندہ ہوں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کا مجھے بھروسا ہے۔ میں جس منصب پر مقرر کیا گیا ہوں ان شاءاللہ وہ میری طبیعت میں ذرّہ برابر بھی تغیر پیدا نہیں کر سکے گا۔ بزرگی اور بڑائی جتنی بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بندوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں۔ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ عمر خلیفہ بن کر کچھ سے کچھ ہو گیا۔ میں اپنی ذات سے بھی حق وصول کر لوں گا اور جس معاملے میں ضرورت ہو گی خود بڑھ کر صفائی پیش کروں گا۔ میں تمھارے اندر کا ایک آدمی ہوں، تمھاری بہبود مجھے عزیز ہے، تمھاری خفگی مجھ پر گراں ہے اور جو امانت میرے سپرد کی گئی ہے مجھے اس کی جواب دہی کرنی ہے"۔

خلافتِ راشدہ کی یہی دستوری نوعیت ہے جس کی وجہ سے امیر کو بیت المال پر بے قید تصرف کا اختیار نہیں۔ وہ اس کو استعمال کرنے کا تو مجاز ہے مگر اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق نہیں بلکہ شریعت کے احکام کے مطابق۔ خلافتِ راشدہ میں نہ امیر خود اپنے اُوپر بیت المال کی رقم کو بے محابا خرچ کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کے اُوپر۔ اس اصول کو حضرت عمرؓ نے اس طرح بیان کیا ہے: "میں نے اپنے لیے اللہ کے اس مال کو یتیم کے مال کے درجے پر رکھا ہے۔ اگر میں اس سے مستغنی ہوں گا تو اس کے لینے سے احتراز کروں گا اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق اس سے اپنی ضرورتیں پوری کروں گا"۔

یہی حال حضرت علیؓ کا تھا جو بیت المال سے بے جا طور پر نہ خود ایک پیسہ لیتے تھے اور نہ کسی دوست اور رشتہ دار کو دیتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے یہ گوارا کر لیا کہ بہت سے لوگ خواہ ان سے کٹ کر دمشق کے اصحابِ اقتدار سے جا ملیں لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ کسی کو ایک پائی بھی بغیر حق دے دیں۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں اگر کوئی شخص بیت المال کی کوئی رقم غلط خرچ کرتا تھا تو اس پر سخت کارروائی کی جاتی تھی اور حضرت عمرؓ نے تو حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے جرنیل تک کو ۱۰ ہزار درہم غلط طور پر استعمال کرنے کے جرم میں معزول کر دیا تھا۔

یہ ساری بحث ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کی پہلی بنیاد یہ تھی کہ حکومت شخصی نہیں دستوری ہے، اور دستور عمل کی حیثیت خدا کی نازل کردہ شریعت کو حاصل ہے جس کی اطاعت امیر و مامور سب کو کرنی ہے اور جس کی اطاعت سے انحراف کے بعد کوئی طاقت باقی نہیں رہتی ہے۔ اس اصول نے آمریت کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، اور قانون کی حکمرانی کے اس دور کا آغاز کیا جس کا اصول یہ تھا کہ ''خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرے تو اس کا بھی ہاتھ قلم کر دیا جائے گا''۔

شورائی اور جمہوری نظام: خلافتِ راشدہ کی دوسری بنیاد یہ تھی کہ اس کا پورا نظام شورائی اور جمہوری تھا۔ اسلام میں شوریٰ کی بڑی اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ خود نبی اکرمؐ سے فرماتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ۳:۱۵۹)

اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔

اور ملّت کے نظامِ اجتماعی کے متعلق قرآن کی واضح ہدایت یہ ہے کہ:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸)

ان کے معاملات باہم مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

خلافتِ راشدہ کا نظام اسی نصِ قرآنی کی اساس پر قائم تھا اور حکومت کے ہر شعبے میں مشاورت کی اسپرٹ کارفرما تھی:

(الف) خلیفہ کا انتخاب باہم مشورے سے ہوتا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کو ثقیفہ بنو ساعدہ میں باہم مشاورت کے بعد منتخب کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی تجویز پر تمام مسلمانوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو برضا و رغبت اپنا خلیفہ چُنا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عمرؓ کو نامزد کرنے سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا اور حضرت عمرؓ نے بیعتِ عام کے بعد اپنے منصب کو سنبھالا۔ حضرت عثمانؓ کے انتخاب میں بھی مدینہ کے ایک ایک فرد سے مشورہ کیا گیا اور مسلمانوں کی رائے سے آپ

خلیفہ منتخب ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے کی تجویز دی گئی تو حضرت علیؓ نے صاف کہا: میری بیعت خفیہ طریقے سے نہیں ہوسکتی۔ یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہوسکتی ہے۔ آپؓ نے اسی موقع پر اسلام کے نظامِ انتخاب کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''تمھیں ایسا کرنے کا (یعنی کسی کو خلیفہ بنانے) کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر خلیفہ بنانا چاہیں گے، وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے''۔

اس طرح خلافتِ راشدہ کے دور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خلافت ایک انتخابی منصب تھا اور مسلمان اپنی آزاد مرضی سے اپنے میں سے بہترین شخص کو اس کام کے لیے منتخب کرتے تھے۔ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اُوپر سے اُمت پر مسلط ہو جائے۔ جب مسلمانوں میں قیصر و کسریٰ کے اس مکروہ طریقے کا آغاز ہو گیا تو خلافت راشدہ ختم ہوگئی اور ملوکیت کا دور شروع ہوگیا!

(ب) خلافتِ راشدہ میں عمال اور گورنر بھی متعلقہ صوبوں کے لوگوں کے مشوروں سے مقرر کیے جاتے تھے اور اگر کسی مقام کے لوگ کسی شخص کو ناپسند کرتے تھے تو اسے تبدیل کر دیا جاتا تھا۔

(ج) حکومت کے سارے معاملات باہم مشورے سے طے ہوتے تھے۔ امیر تمام اہم معاملات میں پالیسی بنانے سے پہلے اربابِ حل و عقد سے مشورہ کرتا تھا اور ان کے مشورے سے جو پالیسی طے ہوتی تھی اسے نافذ کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے دو ادارے تھے۔ ایک مجلس شوریٰ اور دوسرا مسلمانوں کا اجتماعِ عام۔ بالعموم معاملات مجلس شوریٰ ہی میں طے ہوتے تھے لیکن اگر کسی مسئلے پر بڑی مشاورت کی ضرورت محسوس ہوتی تو عام منادی کر دی جاتی اور مسجد میں جمع ہو کر بحث و تمحیص کے بعد اس مسئلے کو جمعیت مسلمین طے کر لیتی۔

یہ بحث و مشورہ پوری طرح آزادانہ فضا میں ہوتا اور ہر شخص اپنی حقیقی رائے کا بے لاگ اظہار کرتا۔ ایک مجلس مشاورت کی افتتاحی تقریر میں حضرت عمرؓ نے صحیح اسلامی پالیسی کو اس طرح بیان فرمایا: ''میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اُٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ لوگ وہ ہیں جو حق کا اقرار کرتے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں''۔

مولانا شبلی نعمانی نے الفاروق میں اس نظامِ مشاورت کی پوری تفصیل دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کا نظام، شوریٰ کی بنیاد پر قائم تھا۔

(د) قانون سازی کا اختیار امیر کو حاصل نہیں تھا۔ اصل قانون قرآن اور سنت ہے لیکن جن چیزوں میں قرآن و سنت خاموش ہیں، امیر کا اجتہاد بھی ایک اجتہاد ہے۔ قانون کا درجہ اسے صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس پر اُمت کے ارباب حل وعقد کا اجماع ہو جائے قانون ساز ادارے (Legislative organ) کی حیثیت اجماع کو حاصل ہے، امیر کی رائے کو نہیں۔ اپنے زمانے میں یہ ایک ایسا انقلابی اقدام تھا کہ ایک عرصے تک تاریخ اس کی اصل اہمیت کو محسوس بھی نہ کر سکی۔ آج جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل وظائف حکومت کی مختلف اداروں میں تقسیم تھی اور اس کے ذریعے نظامِ حکومت میں محاسبہ و توازن کا ایک نظام قائم کیا گیا تھا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کی دوسری بنیاد شوریٰ تھی یہی اسلام کی اصل روح ہے۔ اگر یہ باقی نہ رہے تو پھر خلافت کا نظام بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے خلفائے اربعہ کے زمانے میں مناسب ادارے بھی بنائے گئے تھے تاکہ

شوریٰ کا اصول عملی طور پر بروئے کار آسکے۔ جب خلافت آمریت اور ملوکیت میں بدل گئی تو شوریٰ کا یہ نظام بھی درہم برہم ہوگیا۔ اسلام کے اس شورائی نظام کو اسلامی جمہوریت کہا جاسکتا ہے جس میں جمہور کی رائے اور کردار ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طے کردہ حدود کے اندر واقع ہوتا ہے اور ان حدود سے باہر جانے کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں۔

ریاست کا فلاحی تصور: خلافتِ راشدہ کی تیسری بنیاد ریاست کا فلاحی تصور تھا۔ ریاست محض ایک منفی ادارہ نہیں ہے جو محض اندرونی خلفشار اور بیرونی حملہ سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہو، بلکہ معاشرتی تنظیم کی وہ صورت ہے جس کے ذریعے مثبت طور پر ایک خاص طرزِ زندگی کو ترویج دینے کی منظم سعی وجدوجہد کی جائے۔ اس ادارے کا اصل مقصد نیکی کا فروغ، بدی کا استیصال اور ایک فلاحی معاشرے کا قیام ہے جو انسانوں کی حقیقی ضرورتوں کا اہتمام کرے، اور ان کو مادی اور اخلاقی اعتبار سے اس لائق بنادے کہ وہ زمین پر اللہ کے خلیفہ کا کردار مؤثر انداز میں ادا کرسکیں۔

خلافتِ راشدہ کا مقصد اجتماعی فلاح کا قیام تھا اور اس سلسلے میں خلافتِ راشدہ نے تین بنیادی اقدامات کیے:

۱۔ پہلا اقدام کتاب وسنت کی تعلیم، اور ان کا فروغ اور قیام تھا۔ حضور اکرمؐ نے جب عمرو بن حزمؓ کو یمن کا گورنر بنایا تو ان کو ہدایت کی تھی کہ وہ حق پر قائم رہیں، جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے، اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور نیکی کا حکم دیں اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کریں اور لوگوں کی دل داری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہو جائیں۔

اسی پالیسی پر خلافتِ راشدہ کے پورے دور میں عمل کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: ''اے اللہ! میں اپنے تمام علاقوں کے عہدے داروں پر تجھ کو گواہ ٹھہراتا ہوں

کہ میں نے ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دین اور ان کے نبی ﷺ کی سنت کی تعلیم دیں"۔

ایک دوسرے خطبے میں آپؓ نے فرمایا: "میں نے اِن کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ تم کو تمھارے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسول ؐ کی سنت کی تعلیم دیں۔

خلفائے اربعہ قیامِ فلاح کے لیے سب سے ضروری اس امر کو سمجھتے تھے کہ لوگوں کو فلاح کا صحیح اور اس کا اصل راستہ بتادیں اور یہ علم قرآن اور سنت نبویؐ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کا مقصد دنیاوی اور اُخروی فلاح تھا اور اس کے حصول کے لیے سب سے پہلی ضرورت قرآن اور سنت کی تعلیم اور تنفیذ تھی۔

۲۔ دوسری بنیادی چیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، یعنی ریاست تمام اچھی چیزوں کی ترویج کرے، نیکیوں کو پھیلائے، صدقات کو عام کرے اور خیر کی روایت قائم کرے، نیز ان تمام چیزوں کی حوصلہ افزائی کرے جو کسی طرح بھی حسنات کو فروغ دینے والی ہوں۔ اسی طرح ریاست ان تمام چیزوں کو ختم کرے جو بُرائی اور منکر کو پھیلانے والی ہوں اور معاشرے میں کسی قسم کی بھی گندگیوں کو نہ پنپنے دے تاکہ فرد اور ملت دونوں کو صحیح خطوط پر ترقی کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔ حکومت کی اس پالیسی کی اساس قرآن کا یہ حکم ہے کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (اٰل عمران ۳:۱۱۰)

تم وہ بہترین اُمت ہو جو انسانیت کی طرف بھیجے گئے ہو، پس نیکیوں کا حکم کرو، برائیوں کو روکو، اور تم مومن ہو۔

۳۔ اس سلسلے کی تیسری چیز یہ ہے کہ حکومت عوام کے لیے آسانیاں پیدا کرے، ان پر ظلم و جبر نہ کرے، ان پر ایسا بوجھ نہ ڈالے جس کے وہ متحمل نہ ہو سکتے ہوں۔ نیز

حسنات زندگی کو فروغ دے، اور اس بات کی کوشش کرے کہ اس کے دائرۂ اثر میں کوئی متنفس بلالحاظ مذہب وملت ایسا نہ رہے جو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری نہ کر رہا ہو۔

حضرت عمرؓ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ مجاہدین زیادہ عرصے تک اپنے اہل وعیال سے جدا نہ رہیں، اور کہا کرتے تھے کہ "اور تمھارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمھیں تباہی میں نہ ڈالوں اور تم کو سرحدوں میں روکے نہ رکھوں"۔

اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو ایک خط میں حضرت عمرؓ نے لکھا کہ "سب سے زیادہ خوش نصیب حاکم اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا خوش حال ہو، اور سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا بدحال ہو۔ تم خود بھی اپنے آپ کو کج روی سے بچانا تاکہ تمھارے ماتحت کج روی اختیار نہ کریں"۔

اس حقیقت کو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا تھا کہ: "اے اللہ! جو شخص میری اُمت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا جائے اور وہ اِن کو مشقت میں ڈالے تو، تو بھی اِس کو مشقت میں ڈال۔ اور جو شخص میری اُمت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا تو، تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر"۔

خلافتِ راشدہ کی تمام پالیسیوں میں لوگوں تک حسنات زندگی پہنچانے اور ضرورت مندوں کی کفالت کرنے کا جذبہ کارفرما تھا، بلکہ حضرت عمرؓ تو فرمایا کرتے تھے کہ: "خدا کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو صفاء کے پہاڑوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چرا رہا ہوگا، اس کو بھی اس مال سے اس کا حصہ پہنچے گا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی"۔ اور یہ کہ: "خدا کی قسم! اگر میں اہلِ عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امیر کی

مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی"۔

خلافتِ راشدہ ایک صحیح اور معیاری خادم خلق ریاست تھی اور عوام کی حقیقی فلاح و بہبود اور ان کے لیے آسانیوں کی فراہمی اس کا اصل مقصد تھا اور حکومت کا یہی فلاحی تصور خلافتِ راشدہ کی تیسری بنیادی خصوصیت تھا۔

حقوق اور آزادیوں کا تحفظ: خلافتِ راشدہ کی چوتھی بنیاد تمام شہریوں کے حقوق کا تحفظ اور ان کی شخصی اور سیاسی آزادی کی ضمانت تھی۔ حضرت عمرؓ نے حقوق کی ضمانت ان الفاظ میں دی تھی کہ: "میں کسی شخص کو اس بات کا موقع نہیں دوں گا کہ وہ کسی کی حق تلفی یا کسی پر زیادتی کر سکے۔ جو شخص ایسا کرے گا میں اس کا ایک گال زمین پر رکھوں گا اور اس کے دوسرے گال پر اپنا پاؤں رکھوں گا یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھک جائے"۔

حضرت ابو بکرؓ نے شہریوں کے حقوق کی حفاظت کا اعلان اس بلیغ انداز میں فرمایا تھا کہ: "تمہارے اندر جو بے اثر ہے، وہ میرے نزدیک بااثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے چھینا ہوا حق اس کو واپس دلا دوں۔ اور تمہارے اندر جو بااثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے اس حق کو وصول کر لوں جو اس نے غصب کر رکھا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ خلفائے اربعہ نے یہ کام کر کے دکھا دیا۔ جب بھی کسی عامل نے کوئی زیادتی کی، انھوں نے فوراً اس پر مواخذہ کیا اور اس کا تدارک کیا۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد تھا کہ: "میں اپنے عاملوں کو تمھارے پاس اس لیے نہیں بھیجتا کہ وہ تمھیں ماریں پیٹیں یا تمھارے مالوں کو ناجائز طریقے پر لیں، بلکہ اس لیے بھیجتا ہوں کہ تم کو تمھارا دین سکھائیں اور تمہارے نبیؐ کا طریقہ سکھائیں۔ اگر کسی کے ساتھ اس قسم کی کوئی زیادتی کی گئی ہو تو وہ میرے علم میں لائے۔ اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، میں اس کو زیادتی کرنے والے سے اس کا قصاص ضرور دلاؤں گا"۔

اس نظام میں لوگوں کی آزادیوں کا جو لحاظ رکھا جاتا تھا وہ حضرت عمرؓ کے ان تاریخی

الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے والیِ مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمائے: ''تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا''۔

آپ نے اس بات کی بھی ضمانت دی کہ کسی کو عدل اور قانون کے تقاضے پورے کیے بغیر اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جاسکتا:

وَاللہِ لَا یُوْسَرُ رَجُلٌ فِی الْاِسْلَامِ بِغَیْرِ عَدْلٍ (موطا امام مالک، کتاب الشہادۃ)

خدا کی قسم! اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جاسکتا۔

حد یہ ہے کہ اس نظام میں اس شخص تک کو آزادی حاصل ہوتی تھی اور اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جاتی تھی جو خواہ نظری طور پر حکومت کا باغی ہی کیوں نہ ہو مگر عملاً بغاوت نہ کررہا ہو۔ حضرت علیؓ نے خوارج کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ: ''تم کو آزادی حاصل ہے کہ جہاں چاہو رہو، البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے، بدامنی نہیں پھیلاؤ گے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا''۔

اس سے وسیع تر آزادی کا کون سا تصور ہے جو انسان کرسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کی بڑی اہم خصوصیت اس کا وہ نظام تھا جس میں آزادی اور حقوقِ انسانی کی کُلّی ضمانت تھی اور یہ محض ضمانت نہ تھی بلکہ اس ضمانت کے ایک ایک حرف پر پوری راست بازی کے ساتھ عمل ہورہا تھا۔

تنقید و محاسبہ: خلافت راشدہ کی پانچویں بنیاد اس کا نظامِ تنقید و محاسبہ تھا۔ دنیا کے دوسرے نظام ہائے سیاست میں تنقید کو ایک حق مانا گیا ہے اور سیاسیات کے طالب علم اس امر سے اس طرح واقف ہیں کہ کتنی جدوجہد، کتنی قربانیوں اور کتنی کش مکش کے بعد عوام کا یہ حق دنیائے تہذیب میں تسلیم کیا گیا ہے، لیکن خلافتِ راشدہ کا یہ اعجاز ہے کہ اس میں پہلے دن سے تنقید و محاسبے کی فضا قائم تھی۔ ہر شخص نظامِ حکومت پر نگاہ رکھتا تھا، اور جہاں کہیں بھی جو

بُرائی دیکھتا تھا، اس کو دُرست کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتا تھا، بلکہ گہری نگاہ سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ اور خود آج کے جمہوری نظام میں تنقید و محاسبے کے مقام کے سلسلے میں ایک بڑا باریک لیکن بڑا اہم فرق تھا۔ دوسرے نظاموں میں تنقید زیادہ سے زیادہ عوام کا ایک حق رہی ہے لیکن خلافتِ راشدہ میں یہ صرف حق ہی نہیں بلکہ ایک فریضہ بھی تھی۔ یہ بات لوگوں کی مرضی پر چھوڑ نہیں دی گئی تھی کہ چاہے محاسبہ کریں اور چاہے نہ کریں، بلکہ ان کو یہ تربیت دی گئی تھی کہ دین کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان صحیح طریقے پر تنقید و محاسبہ کرتا رہے اور اگر کوئی شخص اپنے اس فریضے کو ادا نہیں کرتا تو وہ اس کوتاہی پر اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہوگا۔

تنقید و محاسبے کی بنیاد خود حضور اکرم ﷺ کے ان ارشادات میں ہے:

الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ

دین نام ہے خیر خواہی کا، خیر خواہی اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسولؐ کی، مسلمانوں کے قائدین کی اور سب مسلمانوں کی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تمھیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو''۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ''اگر برائی کو دیکھو تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دو، اگر اس کی استطاعت نہ رکھتے ہو تو زبان سے اس کے خلاف آواز بلند کرو، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم از کم دل میں اس کو بُرا جانو، اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے''۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کے باعث اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب نہ پیدا ہو جائے کہ اپنے سامنے بُرے اعمال ہوتے دیکھیں اور انھیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے''۔

خلافتِ راشدہ کے نظام کی بنیاد زبانِ رسالت مآبؐ سے نکلی ہوئی انھی ہدایات پر تھی۔ اس نظام میں معاشرے کا ضمیر بیدار تھا اور فضا صحت مند تنقید اور مخلصانہ محاسبے سے معمور تھی اور یہ مقدس ذمہ داری ایک طرف کسی مداہنت کے بغیر انجام دی جاتی تھی تو دوسری طرف اس کو ان حدود میں رکھا جاتا تھا جو بد نظمی، انتشار، افتراق اور انارکی کے فساد سے معاشرے اور ریاست کو محفوظ رکھیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد جو تاریخی خطبہ دیا اور اس حالت میں ارشاد فرمایا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے: ''اے لوگو! میں اس جگہ اس لیے مقرر نہیں کیا گیا ہوں کہ تم سے بر تر بن کے رہوں۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ کوئی اور اس جگہ کو سنبھالتا، میں تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ جب تم دیکھو کہ میں سیدھے راستے پر چل رہا ہوں تو میری پیروی کرو۔ اور اگر دیکھو کہ میں راستی سے ہٹ گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو''۔

حضرت عمرؓ نے خلافت کا بار اُٹھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ ''اے لوگو! تم نفس کے مقابلے میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ بھلائی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو۔ نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے اس کے بارے میں میری خیر خواہی اور مجھے نصیحت کرتے رہو''۔

دورِ خلافت راشدہ میں امیر المومنین ہر جمعہ کو پبلک سے خطاب کرتا تھا۔ جمعہ کے خطبے میں اپنی پالیسی بیان کرتا تھا۔ اپنے کو خود پبلک کے سامنے پیش کرتا تھا اور پبلک کو پورا پورا موقع دیتا تھا کہ وہ اس پر تنقید کرے، اس سے اختلاف کرے، اس کے سامنے شکایت پیش کرے۔ مختصراً یہ کہ وہ اپنی پالیسی پر عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں خطبۂ جمعہ دینی عبادت کے ساتھ ایک سیاسی ادارہ تھا اور اس کی حیثیت بحث و مباحثے اور افہام و تفہیم کے ایک پلیٹ فارم کی بھی تھی۔

حضرت عمرؓ کے مزاج کی سختی کے متعلق تو ہر شخص بہت کچھ جانتا ہے لیکن دورِ خلافت

راشدہ کے طالب علم کی نگاہ سے یہ بات او جھل نہیں کہ سب کو آپ تنقید و محاسبے کی دعوت دیتے اور اسے صبر و سکون سے برداشت کرتے بلکہ اس تنقید سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے میں بھی ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ انھوں نے کبھی بھی لوگوں کو اس حق سے کسی درجے میں بھی محروم کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جو پوزیشن انھوں نے اختیار کی وہ ایک ایسی اعلیٰ مثال ہے جو انسانوں کے لیے ہمیشہ روشنی کا مینار رہے گی۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد سے نکلے، چند قدم چلے ہوں گے کہ ایک خاتون (خولہ بنت حکیم) دوسری طرف سے آئیں۔ آپ نے ان کو سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا اور فوراً برس پڑیں: ''عمرؓ! تمہارے حال پر افسوس ہے، میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے کہ تم عمیر عمیر کہلاتے تھے اور لٹھیا لیے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا جب تم عمر کہلانے لگے اور اب یہ زمانہ ہے کہ میں دیکھ رہی ہوں کہ امیر المومنین بنے پھر رہے ہو۔ رعایا کے معاملے میں خدا سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا وہ آخرت کے عالم کو بالکل اپنے آپ سے قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہو گا وہ ہمیشہ اس فکر میں رہے گا کہ خدا کی دی ہوئی فرصت رائیگاں نہ ہونے پائے''۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تقریر کو بڑے غور سے سنا اور جن صحابہؓ نے ان کے سخت لہجے کی شکایت کی، ان کو خاموش کر دیا۔

اسی طرح ایک اور شخص نے حضرت عمرؓ کو سختی سے ٹوکا اور آپ سے کہا: ''اے عمر! اللہ سے ڈر! اللہ سے ڈر! (اور اس جملہ کو تین بار کہا)، ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اب بس بھی کرو، بہت ہو چکا تو حضرت عمرؓ نے یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے: ''ان کو کہنے دو، اگر یہ ہم کو یہ باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں، اور اگر ہم ان کی ان نصیحتوں کو قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں''۔

خدا کی قسم! یہ الفاظ انسانی آزادی اور حق تنقید و محاسبے کا سب سے بڑا چارٹر ہیں، اور خلافتِ راشدہ کا نظام اس تنقید و محاسبے کی بنیاد پر قائم تھا۔ اسی کی وجہ سے حکومت راہِ حق پر

قائم رہتی تھی اور ہر کجی سے محفوظ رہتی تھی۔ استحکام اور ترقی کے لیے اس سے بڑی ضمانت اور کون سی ہوسکتی ہے؟

پارٹی پرستی سے احتراز: خلافتِ راشدہ کی ایک اور بنیادی خصوصیت پارٹی پرستی سے کامل احتراز تھا۔ سیاسیات کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ معاملات کی انجام دہی میں نمائندگی (Representation) کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں بلاواسطہ رابطہ قائم کرنا ممکن نہ ہو۔ یونان کی شہری حکومت میں کسی نمائندہ اسمبلی کا وجود نہ تھا۔ اس لیے کہ وہاں پوری شہری آبادی ایک اسمبلی کی حیثیت رکھتی تھی اور جب بھی حکومت کو مشورے کی ضرورت پیش آتی تمام لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اسی اجتماع میں فیصلہ کرلیا جاتا۔ جب ہیئتِ اجتماعی وسیع ہوئی تو بلاواسطہ جمہوریت کے مقابلے میں نمائندہ جمہوریت کا ظہور ہوا۔ اور نمائندگی کے اس نظام میں نمائندوں کو شہریوں کی رائے اور ان کی مرضیات کا حقیقی نمائندہ بنانے کے لیے سیاسی پارٹیوں کا نظام وضع کیا گیا۔ اس لیے کہ اگر عوام کے نمائندوں کو ان کے نظریات کا نمائندہ ہونا چاہیے تو ضروری ہے کہ پروگرام اور پارٹی کی ذمہ داری کا نظام موجود ہو۔

اس پارٹی کے نظام نے جہاں بہت سی حقیقی ضرورتوں کو پورا کیا، نیز جہاں وسیع و عریض ممالک اور لاکھوں اور کروڑوں کی آبادی میں اس کا قیام ناگزیر ہوگیا، وہیں اس میں ایک بڑی خرابی بھی رونما ہوئی اور وہ پارٹی پرستی، یعنی پارٹی کو حق و باطل کا معیار جان لینا، اصول اور اقدار کی بالادستی سے صرفِ نظر اور اپنے ضمیر کی آواز کے مقابلے میں محض پارٹی کی موافقت کے جذبات سے کام کرنا۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں ہمیں یہ اہم چیز نظر آتی ہے کہ اس میں اپنے دور کے قبائل، برادریوں اور مشترک اجتماعی وجود رکھنے والے گروہوں کو ختم نہیں کیا گیا لیکن پارٹی بازی اور خاندانی، قبائلی یا گروہی مفادات کو حق و باطل کا معیار ماننے کا اصول بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا گیا۔ گروہ اور احزاب اس لیے تھیں کہ لوگ ایک دوسرے کو جانیں، اجتماعی نظام زیادہ آسانی سے کام کرسکے۔ ہر شخص کی رائے معلوم کرنے کے بجائے ایک گروہ اور پارٹی کے قائدین کی رائے معلوم کرلی جائے اور اس طرح اس پورے گروہ کے نقطۂ نظر سے آگاہی حاصل کرلی جائے لیکن تربیت

اور تعلیم کے ذریعے سے لوگوں میں پارٹی کی عصبیت کو، پارٹی بازی اور پارٹی پرستی کو ختم کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ راشدہ نے کسی جبر و تشدد کے بغیر، غلط احساسات کو زیادہ سے زیادہ دبا دیا، اور پارٹی پرستی کے فتنے کو اخلاقی سنوار کے ذریعے ختم کر دیا۔

دورِ خلافت راشدہ میں سب سے پہلے تو مہاجرین اور انصار کے دو گروہ تھے اور ان کے سربراہ اپنی پارٹی کے نمائندوں کی حیثیت سے امورِ سلطنت میں تعاون کرتے تھے۔ پھر خود انصار کے دو اہم قبیلے اوس اور خزرج کی شکل رکھتے تھے اور جس شخص نے بھی ثقیفہ بنو ساعدہ کی بحثوں کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کے سیاسی وجود اور اس کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے۔ اسی طرح مہاجرین میں کم از کم تین نمایاں پارٹیاں نظر آتی ہیں۔ بنواُمیہ، بنوزہرہ اور بنو ہاشم۔[1]

حضرت ابو بکرؓ نے ثقیفہ بنو ساعدہ میں اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ امیر مہاجرین میں سے ہوگا اور انصار ان کے وزیر ہوں گے۔ خلفائے اربعہ نے مناصب کی تقسیم کے سلسلے میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ مختلف گروہوں میں سے اہل لوگوں کو مناصب دیے جائیں اور اس طرح ہر پارٹی کو نمائندگی ملتی رہے اور شکر رنجی نہ پیدا ہو۔

حضرت عمرؓ نے پارٹیوں کو ختم نہیں کیا، صرف پارٹی پرستی سے لوگوں کو منع کیا۔ ان کا ارشاد ہے کہ "اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا وہ شخص جو حق کے معاملے میں اپنی پارٹی کی ناانصافیوں کو گوارا کرنے والا ہو۔ یہاں اعتراض حزب کے وجود پر نہیں پارٹی کی ایسی پرستش پر ہے کہ حق و ناحق کا اختیار ہی ختم ہو جائے[2]، اور غالباً یہی خود قرآن پاک کے اس ارشاد کا بھی

---

1 مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب اسلامی ریاست، شہریت کے حقوق و فرائض (۴) میں تحریر فرماتے ہیں: انصار اور مہاجرین کی ان دو پارٹیوں کے علاوہ خود مہاجرین کے اندر تین نمایاں پارٹیاں موجود تھیں۔ ○ بنواُمیہ کی پارٹی عثمان غنیؓ کی قیادت میں، ○ بنوزہرہ کی پارٹی سعد اور عبدالرحمن بن عوفؓ کی سرکردگی میں، ○ بنو ہاشم کی پارٹی حضرت علیؓ اور عباسؓ ابن عبدالمطلب کی رہنمائی میں۔ اور ان میں سے بعض کا اختلاف حکومت کے ساتھ کھلا ہوا تھا لیکن حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت نے انتہائی رواداری کے ساتھ اس اختلاف کو انگیز کیا۔ (ص ۳۲)

2 خود خوارج کے سلسلے میں جو پالیسی حضرت علیؓ نے اختیار فرمائی وہ بھی اسی مسلک پر روشنی ڈالتی ہے۔ خوارج کی حیثیت ایک متشدد حزب اختلاف کی تھی مگر آپؓ نے ان کو تحریر فرمایا کہ جب تک تم بدامنی نہیں پھیلاتے اور کشت و خون نہیں کرتے ہم تم سے تعرض نہیں کریں گے اور تمھیں اجازت ہو گی کہ جہاں چاہے رہو۔

منشا ہے کہ :

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات ۴۹:۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اور خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ نیکوکار اور پرہیز گار ہے۔

یہاں نہ صرف یہ کہ 'شعوب' اور 'قبائل' کے وجود کو ختم کرنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں بلکہ اس کی ایک اہم ضرورت اور افادیت بیان کی گئی ہے۔ یعنی لتعارفوا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، امتیازات کو محسوس کر سکو، لیکن ساتھ ہی قبائل پرستی، گروہ پرستی اور قوم پرستی کی جڑ یہ کہہ کر کاٹ ڈالی گئی ہے کہ لتعارفوا کی حد سے آگے نہ بڑھنا کیوں کہ اسلام کی نگاہ میں حق اور شرف کا معیار قوم، قبیلہ اور گروہ نہیں ہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

یہی اصول پارٹیوں کے سلسلے میں خلافتِ راشدہ نے اختیار کیا، یعنی پارٹیوں کے وجود کو ختم نہیں کیا گیا صرف پارٹی پرستی کو ختم کیا گیا۔ حق کا معیار سب کے لیے قرآن اور سنت نبویؐ قرار پایا اور ہر ایک نے اسی سے استدلال کیا۔ باقی نقطۂ نظر اور دوسرے اختلافات کی پہچان کے لیے پارٹیاں موجود رہیں اور نظام خلافت کو صحت مند بنیادوں پر ترقی دینے میں مدد و معاون ثابت ہوتی رہیں۔

معیارِ قیادت: خلافتِ راشدہ کی آخری خصوصیت امیر کا ایک خاص کردار ہے جسے اچھی طرح سمجھے بغیر اس دور کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کا امیر ان کا بہترین شخص ہوتا تھا۔ فہم وتدبیر، اور تقویٰ اور صلاحیت کار میں سب پر فوقیت رکھتا تھا اور اس کے ہر کام کا محرک خدا کا خوف اور اُمت کی فلاح تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کا کیا عالم تھا۔ اس کا ذکر حضرت علیؓ کی زبان سے سنیے: یہ تقریر حضرت

علیؓ ابن ابی طالب نے آپ کی وفات کے وقت کی تھی: اے ابو بکر! اللہ تم پر رحم کرے، واللہ! تم پہلے آدمی تھے جس نے رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا، ایمان و اخلاص میں تمھارا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ خلوص و محبت میں تم سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اخلاق و قربانی، ایثار و بزرگی میں تمھارا کوئی ثانی نہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت تم نے کی اور رسولؐ اللہ کی رفاقت میں جس طرح ثابت قدم رہے اس کا بدلہ اللہ ہی تمھیں دے واللہ تم اسلام کے حصن حصین تھے۔ کافروں کے لیے تمھارا وجود انتہائی اذیت بخش تھا۔ تمھاری کوئی دلیل وزن سے خالی نہ ہوتی تھی اور تمھاری بصیرت فہم و کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمھاری سرشت میں کمزوری کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔ تم ایک پہاڑ کی مانند تھے جسے تند و تیز آندھیاں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔ اگرچہ تم جسمانی لحاظ سے کمزور تھے لیکن دینی لحاظ سے جو قوت تم کو حاصل تھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تم دنیا والوں کی نظروں میں واقعی ایک جلیل القدر انسان تھے اور مومنوں کی نگاہوں میں انتہائی رفیع الشان شخصیت کے مالک، لالچ اور نفسانی خواہشات تمھارے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ ہر کمزور انسان تمھارے نزدیک اس وقت تک قوی تھا اور ہر قوی انسان اس وقت تک کمزور تھا جب تک تم قوی سے کمزور کا حق لے کر نہ دلوا دیتے تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں تمھارے اجر سے محروم نہ رکھے اور ہمیں تمھارے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑ دے بلکہ ہمارے سہارے کے لیے کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے۔

حضرت ابو بکرؓ میں ذمہ داری کا احساس اتنا تھا کہ گھنٹوں رویا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاش! میں پتھر ہوتا مگر امارت کے اس بار سے آزاد ہوتا۔ شخصی سیرت کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی پر زیادتی نہ کی، کبھی کسی کو دُکھ نہ پہنچایا اور حق کی راہ میں کبھی کوئی کمزوری نہ دکھائی۔ خدمت خلق کا یہ عالم تھا کہ خلافت سے پہلے محلے کی جن بیواؤں کا سودا لا کر دیتے تھے اور جن کی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے خلافت کے بعد بھی اس کام کو اسی طرح جاری رکھا۔ دن کو امورِ خلافت کی دیکھ بھال اور رات کو عبادت کا اہتمام ان کا روزمرہ کا شعار تھا۔ ہمہ وقتی خدمت کے باوجود کوئی معاوضہ لینے پر تیار نہ ہوتے تھے اور بہ مشکل تیار ہوئے تو بھی وفات کے وقت

ساری رقم اپنا مکان بیچ کر ادا کر دی۔

یہ تھی خلیفۂ اوّل کی سیرت! اسی لیے آپؓ کی وفات پر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ: ''اے خلیفۂ رسولؐ اللہ! تمھاری وفات نے قوم کو سخت مصیبت اور مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے، ہم تو تمھاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، تمھارے مرتبے کو کس طرح پا سکتے ہیں؟

حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو حضرت علیؓ نے ان کو یہ نصیحت کی تھی کہ ''اگر آپ اپنے پیش رو کی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو قمیص میں پیوند لگا لیجیے، تہمد اُونچی کیجیے، جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیجیے، جرابوں میں پیوند لگا لیجیے، ارمان کم کیجیے اور بھوک سے کم کھایئے''۔

حضرت عمرؓ اس معیار پر جس سختی سے قائم رہے کہ اس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ حضرت عمرؓ کسی کرّوفر کے قائل نہ تھے۔ زمین پر سوتے، پیدل پھرتے، اپنے اُونٹ کی نکیل تھام کر خود چلتے اور اپنے غلام کو آرام کرنے کے لیے اُونٹ پر بٹھا دیتے۔ اپنے کپڑے خود دھوتے اور کپڑے اتنے کم تھے کہ ایک مرتبہ وقت پر اس لیے مسجد نہیں آسکے کہ کوئی دوسرا جوڑا نہ تھا اور آپ اپنی قمیض دھو کر سکھا رہے تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ سفر شام کے دوران ایک جگہ راستے میں پانی عبور کرنا پڑا تو بے تکلف اُونٹ سے اُترے، چرمی موزے ہاتھ میں لیے اور اُونٹ کی نکیل تھام کر پانی میں گھس گئے۔ فوج کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے لوگ آپ کی اس بات کو دیکھ کر بڑا تعجب کریں گے، تو آپؓ نے فرمایا: اے ابوعبیدہؓ! کاش یہ بات تمھارے سوا کوئی اور کہتا۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہم سب سے زیادہ ذلیل تھے، ہم سب سے زیادہ حقیر تھے اور ہم سے زیادہ کم تعداد کوئی اور قوم دنیا میں نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو اسلام کے ذریعے عزت دی۔ یاد رکھو! اگر تم اسلام کی بخشی ہوئی عزت کے سوا کوئی اور صورت عزت کی حاصل کرنا چاہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ذلیل کر دے گا''۔

تقویٰ کا یہ حال تھا کہ دن بھر عوام کی خدمت میں اور اُمورِ سلطنت کی انجام دہی میں سر گرداں رہتے اور رات بھر عبادت کرتے اور کہتے کہ اگر میں دن کو غافل ہو جاؤں تو اُمت

تباہ ہو جائے اور اگر رات کو غافل ہو جاؤں تو میں تباہ ہو جاؤں۔ بیت المال سے بقدر کفالت لیتے اور اگر اپنے بچوں کے پاس بھی کوئی غیر معمولی چیز دیکھ لیتے تو اس کو فوراً بیت المال میں داخل کرادیتے۔ قحط کے زمانے میں خود گوشت اور گیہوں کھانا ترک کر دیا اور فرمایا کہ جب تک میں خود وہی تکلیف نہ اُٹھاؤں جو عوام اُٹھا رہے ہیں، مجھے اِن کی مصیبت کا صحیح اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیت المال کی چیزوں کی ایسی نگرانی کرتے تھے کہ ایک حبّہ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتا تھا۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتے تھے اور ایک مرتبہ جب ان کی بیٹی نے اہل و عیال کو آرام پہنچانے کے لیے کہا تو فرمایا کہ اے بیٹی! تو نے اپنی قوم کے ساتھ تو خیر خواہی کی لیکن اپنے باپ کے ساتھ بد خواہی کی ہے۔ میرے اہل و عیال کا حق میری جان اور میرے مال میں ہے لیکن میرے دین اور میری امانت کے اندر انھیں دخل انداز ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ایک مرتبہ بیت المال کا ایک اُونٹ کھو گیا تو آپ دھوپ میں مارے مارے پھرے تا کہ اس کو ڈھونڈھ لائیں۔ حضرت علیؓ نے یہ حال دیکھا تو بے ساختہ کہا:

قَدْ أَتْعَبْتَ الْخُلَفَاءَ بَعْدَكَ

آپ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔

حضرت عمرؓ گلیوں میں پھرتے تھے کہ کوئی مستحق حکومت کی مدد سے محروم نہ رہ جائے اور اگر کسی کی مصیبت کا کوئی واقعہ سامنے آتا تو کانپ اُٹھتے۔ خود سامان اُٹھا کر لاتے، کھانا پکا کر کھلاتے اور کیا کیا کچھ نہ کرتے!

اور اس سب کے بعد بھی آخیر عمر میں کہا کرتے تھے کہ اگر برابر سرابر چھوٹ جاؤں، نہ انعام ہی پاؤں اور نہ ہی سزا کا مستحق ٹھہرایا جاؤں تو بڑی بات ہے۔

حضرت عثمانؓ کا حال بھی یہ تھا کہ اپنا مال اور اپنی دولت دین اور اہلِ دین کی ضرورتوں کے لیے وقف کر رکھی تھی اور اُمت کی بہبود کی خاطر اپنا آرام تج دیا تھا، حتیٰ کہ قوم کو فتنے سے بچانے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دی۔

یہی عالم حضرت علیؓ کا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا اور وہ اپنی

ہر صلاحیت اور اپنی طاقت کی ہر رمق اُمت کی بہبود کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور اپنی ذات کے لیے معمولی سے معمولی چیز بھی نہیں لیتے۔

خلفائے راشدینؓ نے اپنی ذاتی سیرت اور خدمت دین و مسلمین کے ذریعے اُمت کا اعتماد حاصل کیا اور اس دور کی جو بھی خوبیاں نظر آتی ہیں ان کے فروغ میں انسانیت کے ان ہی بہترین نمونوں کا بڑا دخل ہے۔ خلافتِ راشدہ کا مزاج اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دین کے بے لوث خادم اس نظام کو چلائیں جبھی وہ کامیاب ہو سکتے ہیں، اور جب یہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتیں برسانے لگتا ہے، اور دنیا خیر و فلاح سے بھر جاتی ہے۔

اُمت مسلمہ نہ انگلستان کا نظام چاہتی ہے نہ روس کا، نہ امریکا کے طریقوں سے اسے دل چسپی ہے نہ فرانس کے۔ بلاشبہ اپنے زمانے اور اپنی ضرورتوں کے مطابق ان کو اختیار ہے کہ سیاسی اور اداراتی دروبست کا اہتمام کریں، لیکن اصولِ اقدار اور معیار کے باب میں وہ تو خلافت راشدہ کے اصولوں کا احیا چاہتی ہے اور ہر اس پیکر کو پسند کرے گی جو ان اصولوں کو ٹھیک ٹھیک قائم کر سکے۔ ؎

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خم زلفِ کمال کے

(مارچ ۲۰۱۲ء)

مدینہ کی ریاست، حکومت کے لیے رہنمائی

پاکستان تحریک انصاف کی حکومت ۲۰۱۸ء میں برسرِاقتدار آئی تو اس جماعت کے سربراہ عمران خان نے یہ بیان جاری کیا کہ وہ پاکستان کا نظام، ریاستِ مدینہ کی طرز پر چلانا چاہتے ہیں۔ عمومی طور پر تمام حلقوں کی جانب سے اس بیان کا خیر مقدم کیا گیا، (ستم ظریفی کہ عملاً اس جانب کوئی پیش رفت نہ ہوسکی) پروفیسر خورشید احمد نے ریاست مدینہ کی خصوصیات کے حوالہ سے اس مضمون میں بارہ نکات پیش کیے ہیں یہ ملک کے داخلی نظام، خارجہ پالیسی، عوام کی فلاح، معاشرے کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی، غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات جیسے اہم معاملات پر روشنی ڈالتے ہیں ان نکات میں حکومتِ وقت کے لیے مخلصانہ رہنمائی موجود ہے۔

وزیراعظم پاکستان عمران خان بار بار یہ کہتے ہیں کہ ان کا آئیڈیل مدینہ کی ریاست اور حکومت ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے یقیناً ان کا دل بھی یہی چاہتا ہوگا کہ وہ یہ کام کریں اور اس کی عملی تشکیل کی سمت میں بامعنی قدم بڑھائیں۔ ہمیں اس خواہش کو محض سیاسی بیان سمجھنے کے بجائے ان کے قول کو اقبال، قائداعظم اور تحریکِ پاکستان کے تصورِ پاکستان کا اعادہ سمجھنا چاہیے اور حکومت اور قوم دونوں کی ذمہ داری ہے کہ عملاً اس سمت میں پوری یکسوئی کے ساتھ پیش قدمی کریں۔

ریاست مدینہ ماڈل: بنیادی غور طلب امور

ریاست مدینہ کے ماڈل کے حوالے سے بنیادی طور پر غور طلب باتیں حسبِ ذیل ہیں:

نبی پاکؐ کی مرکزیت: مدینہ کے ماڈل میں خود نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مرکزیت حاصل ہے، یعنی آپؐ کے فرمودات (جو وحی پر مبنی ہوتے تھے)، آپؐ کا کردار، آپؐ

کے فیصلے اور بحیثیت مجموعی آپؐ کا قائم کردہ طرزِ حکمرانی ہی اصل ماڈل ہے۔ چنانچہ حضورؐ کی ذات سے تعلق، ان سے رہنمائی لینا اور سنت کو معیار (Criteria) بنانا، یہ اس ریاست کی پہلی ضرورت ہے۔

مدینہ، مکّہ کا تسلسل: دوسری بات یہ ہے کہ ریاست مدینہ دراصل مکّہ میں پیش کی جانے والی دعوت، جدوجہد، کش مکش اور تربیت کا تسلسل اور تکمیل ہے۔ مدینہ کے معنی صرف مدینہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد مکّہ اور مدینہ کا رسالتِ محمدیؐ کا پورا دور ہے۔ گویا کہ مکّہ اور مدینہ میں دُوئی نہیں یک رنگی اور یک جائی ہے۔

میثاق: مدینہ کی سیاسی تنظیم کی بنیاد: تیسری چیز یہ ہے کہ مدینہ کی سیاسی تنظیم اور بنیاد دو میثاق ہیں۔ یہ دونوں اہم تاریخی دستاویزات ہیں جن کا از سرِ نو مطالعہ اور تجزیہ کرنے اور ان سے رہنمائی لینے کی ضرورت ہے۔ ان کی اشاعت بھی اس کے لیے مفید اور ضروری ہے۔

پہلا میثاق وہ ہے جو حضورؐ اور اہلِ مدینہ میں سے قبولِ اسلام کرنے والوں کے درمیان ہوا، خاص طور سے 'بیعت عقبۂ ثانی'۔ اس بیعت میں جس چیز پر لوگوں نے بیعت کی وہ حضورؐ کو صرف نبی ماننا ہی نہیں تھا بلکہ انھیں قائد، سربراہِ مملکت اور مدینہ کا سربراہ تسلیم کرنا تھا۔ بیعت عقبۂ ثانی کے موقعے پر پوری بحث کو پڑھیں تو وہاں یہ الفاظ بیان ہوئے تھے کہ مدینہ سے آنے والے ایک یا ایک سے زیادہ لوگوں نے یہ کہا کہ سوچ لو تم کیا بات تسلیم کرنے جارہے ہو؟ یہ ماننے کے بعد ساری دنیا تمھارے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی اور تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے اور ان کے دفاع اور دین کے لیے جان دینے کا عہد کر رہے ہو۔ یہ اُن کا وژن تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، ہم سمجھتے ہیں کہ کیا عہد کر رہے ہیں اور ہمیں یہ قبول ہے۔ گویا یہ حضورؐ کو نبی ماننا، ان کو پولیٹکل اتھارٹی ماننا اور ان کی بنیاد پر ایک مملکت قائم کرنا ہے۔ یہ پہلے میثاق کی بنیاد تھی۔ یہ حضورؐ کے اور حضورؐ کے ماننے والوں کے درمیان میثاق ہوا تھا۔

دوسرا 'میثاقِ مدینہ' ہے جو پہلی ہجری میں غیر مسلموں کے ساتھ ہوا تھا، جس میں خصوصیت سے بنی اسرائیل، مدینہ کے قبائل اور قبائل کے سردار شامل تھے۔ اس معاہدے

کی روح یہ ہے کہ حضوؐر نے غیر مسلموں کو غیر مسلم رہتے ہوئے اسلامی ریاست کا شہری مانا، ان کے حقوق طے کیے اور یہ اہداف طے کیے کہ کس طرح سے مل کر دفاع کریں گے۔ طے ہوا کہ یہود اپنے دفاعی اخراجات خود برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے دفاعی اخراجات خود برداشت کریں گے۔

معلوم ہوا کہ شہریت، حقوق اور ذمہ داریاں ان دونوں میثاقوں کی بنیاد ہیں۔ اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ مختلف عقائد کے حامل افراد ایک ریاست کے شہری ہو سکتے ہیں اور اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے مشترک تعلقات (Joint relationship) کے ساتھ ریاست کا نظام چلایا جاسکتا ہے، یعنی ایک یہ کہ مسلمانوں کا حضوؐر کو بحیثیت نبی ماننا اور ریاست کا سربراہ ماننا، اور غیر مسلموں کا حضوؐر کو نبی تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی انھیں ریاست کا سربراہ ماننا اور آخری سیاسی اتھارٹی تسلیم کرنا۔ پھر یہ کہ ایک اسلامی قیادت اور اسلامی مملکت کا غیر مسلموں کے حقوق اور ان کے مقام کا تعین کرنا۔ مدینہ کا ماڈل سمجھنے کے لیے یہ دونوں معاہدے بنیاد ہیں۔

مسجد: سماجی، حکومتی وعدالتی سرگرمیوں کا مرکز: حضوؐر نے مدینہ میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا ہے کہ جہاں آپؐ کی اُونٹنی بیٹھی، آپؐ نے وہ زمین حاصل کرکے وہاں مسجد کی تعمیر فرمائی۔ ہمارے وزیراعظم صاحب کو جاننا چاہیے کہ یہ مسجد عبادت گاہ بھی تھی اور مشاورت کے لیے آج کی اصطلاح میں پارلیمنٹ بھی، مقامِ عدل و قضا بھی تھا اور اُمورِ خارجہ واُمورِ دفاع کا مرکز بھی۔ یہ تمام اُمور اللہ کے گھر میں، اللہ کی رہنمائی اور رسولؐ کی قیادت میں، آخرت کی جواب دہی اور انسانیت کی فلاح کے لیے انجام پاتے تھے۔

مدرسہ: تعلیم وتدریس کی اہمیت: پھر اس مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جس کا مطلب ہے کہ ریاست مدینہ میں جتنی اہمیت مسجد کی ہے، اسی قدر اہمیت قرآن وسنت کی تعلیم وتدریس اور علم کی بھی ہے۔

ماں: خاندان کے ادارہ کی بنیاد: اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کا دین میں بڑا بنیادی کردار ہے۔ انھوں نے حضوؐر کی تسکین، مالی معاونت، وفاداری، اولاد کی تربیت کی اور صحابیات نے مکّی دور

میں بے پناہ قربانیاں دیں۔ تاہم، ماں کا کردار مدینہ میں آ کر ایک اور شان کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ خاندان کی تشکیل، مذکورہ تمام قربانیوں سے بڑی قربانی یہ کہ اُمت کی اصلاح اور تربیت کے لیے اُم المومنین کا اپنی نجی زندگی کو عام کر دینا ہے۔ یہ مرحلہ مدینہ منورہ میں پیش آیا، جس نے رسولؐ کی نجی زندگی کو پبلک زندگی میں تبدیل کر دیا اور نجی اور مجلسی زندگی کا ہر پہلو اُمت کے لیے سنت اور نمونہ قرار پایا۔

مواخات کا نظام: اس کے بعد آپؐ نے اسلامی معاشرت اور مواخات کے فروغ کے لیے معاہدہ مواخات کیا، یعنی مدینہ کی نئی آبادی مہاجر اور سابقہ شہری انصار کے درمیان نئے تعلقات قائم کیے۔ فنی طور پر دیکھیں تو دو مختلف قومیں، مختلف روایات کی علم بردار ہیں۔ قریش عرب میں ایک اُونچا مقام رکھتے تھے مگر یہاں وہ ایک مجبور اور مہاجر کی حیثیت سے آئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا کہ کیسے سوسائٹی کے اندر ایک نیا بھائی چارہ، اخوت اور معاشرتی تعلقات قائم کیے جائیں؟ اس کو مواخات کہا جاتا ہے اور یہی مواخات اسلامی وحدت اور اُمت بنانے کی بنیاد بن گئی اور مدینہ کو صحیح معنوں میں مدینہ بنا دیا۔ پھر مدینہ محض انصار اور مہاجروں کا مسکن نہیں رہا بلکہ اُمت مسلمہ کا مرکز و محور بن گیا اور ہمیشہ رہے گا۔

مساوات: تمام شہریوں کے درمیان: مدینہ کی ریاست سے مساوات کا تصور اُبھرتا ہے۔ ایسی مساوات کہ جس میں: مسلم و غیر مسلم کے درمیان، امیر اور غریب کے درمیان، اعلیٰ نسب اور کم نسب کے درمیان اور غلام اور آقا کے درمیان انصاف کرنا ہے بلکہ انصاف سے آگے بڑھ کر اپنا حق دوسرے کے لیے قربان کرنا، یعنی احسان کا رویہ اپنانا۔

مفادِ عامہ: اجتماعی زندگی کا ہدف: یہاں سے مفادِ عامہ سامنے آتا ہے۔ اسلام میں جہاں اللہ سے تعلق اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، وہیں ہماری اجتماعی زندگی اور معاشرت کا مرکز مفادِ عامہ ہے، یعنی فلاحی ریاست میں فلاحی معاشرے کا قیام ضروری ہے۔ قرآنِ پاک میں جس طرح نماز اور زکوٰۃ کی تلقین ہے، اسی طرح حقوق العباد کی ادائیگی کا حکم بھی ہے۔ خون کے رشتوں کے احترام اور ان کو نفقہ اور میراث کے قوانین کے

ذریعے ایک سوشل سیکورٹی کے نظام میں مربوط کرنا ضروری ہے۔ پھر سوسائٹی کے مظلوم اور محروم طبقات، خصوصیت سے یتامی، مساکین اور بیواؤں کی کفالت کے لیے فکر مندی، اور زکوٰۃ سے بھی زیادہ انفرادی اور اجتماعی ایثار کے ذریعے وسائل فراہم کرنے کی ہدایت۔ اسلام کا یہ فلاحی نظام اخلاق اور قانون دونوں کو موئثر طور پر استعمال کرتا ہے اور یتیم اور مسکین کے حق سے لاپروائی کو دین اور یومِ آخرت کے انکار سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ عمل مدینہ کے فلاحی نظام کو تاریخ کا ایک منفرد نظام بنادیتا ہے۔

مجاہدہ اور جہاد: پھر تمام غزوات اور سرایا اسی زمانے میں ہوتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ، دعوت، ہجرت برائے دعوت۔ نیز ہجرت دعوت بھی تھی اور ظلم سے بچنے کا ذریعہ بھی۔ حضوؐر کے دور میں اور حضوؐر کے بعد دنیا کے گوشے گوشے میں لوگوں کو دعوت کے لیے بھیجا گیا۔ اس مجاہدے کا آغاز دعوت اور اس کا فطری نتیجہ، حق و باطل کی کش مکش اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوشش ہے۔ اس کا ایک مرحلہ مقابلہ اور تصادم بھی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ شرک اور نفاق، بیرونی اور اندرونی چیلنجوں سے نپٹنے کے مراحل میں جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے۔

مذاکرات اور سفارت کاری: حضوؐر نے مدینہ کے دورِ حکمرانی میں اس زمانے کے تمام حکمرانوں کے نام خطوط لکھ کر سفیروں کو روانہ کیا۔ اسی طرح قریش کے ساتھ مذاکرات کیے اور صلح حدیبیہ کا معاہدہ کیا۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ حق کی آبیاری کے لیے دعوت، دفاع اور مذاکرات سب چیزیں ضروری ہیں۔

معبود حقیقی کا قرب: ان سب چیزوں کا ہدف اور مقصود معبودِ حقیقی کا قرب ہے، اس کی رضا کا حصول ہے اور اس کے حصول پر کامیابی ہے۔

محمدؐ، مدینہ، میثاق، مسجد، مدرسہ، ماں، مواخات، مساوات، مفادِ عامہ، مجاہدہ اور جہاد، مذاکرات اور معبودِ حقیقی کا قرب کے یہ سارے ۱۲ نکات 'میم' سے شروع ہوتے ہیں۔

یہ ہے مدینہ کا ماڈل اور یہ ہیں اس ماڈل کے بنیادی اجزا۔ آج کے زمان و مکان

(Time and Space) میں آپ جتنا بھی رنگ بھر لیں اور اس کو وسعت دے لیں، آپ کے لیے، اُمت کے لیے اور انسانیت کے لیے سعادت مندی کا راستہ ان نکات پر تشکیل دی گئی آں حضورؐ کی قائم کردہ ریاستِ مدینہ کے اتباع ہی میں مضمر ہے۔

(دسمبر ۲۰۱۸ء)

اشاریہ

آ

آخرت,5,11,12,38,40,51,84,138,
188,193,213,223,225

آڈیٹر جنرل,83

آرنلڈ جے ٹائن بی(Arnold J. Toynbee),
7

آزاد پٹھان ریاست,18,19

آزاد کشمیر,181,188

آزاد نظام قضا,43

آزادی,6,17,105

آزادیِ انتخاب,6

آسٹریا (Austria),155

آسٹریلیا (Australia) ,155

آفتاب احمد شیر پاؤ(سرحد کے وزیر اعلیٰ),176

آل انڈیا ریڈیو(لاہور),9

آل انڈیا مسلم لیگ,17

آمریت,51,203,206

آئرلینڈ (Ireland) ,155,164

آئینی ترمیم آٹھویں,63,143/18ویں,53,55,
82,94,97/19ویں,53,55/21ویں,
53,55/25ویں,173

ا

اباحیت پسند,22

ابن تیمیہؒ,32

ابن خلدون,7

اٹلی (Italy),93,155

اجتماعی زندگی کا نظام,14

اجتہاد,7,37,44,129

اجماع,44,129,182,183,205

احتساب, 48, 50, 75, 83, 84, 98, 135,
152,153,155,158,159

احکام اسلام,132,143,156

احمد سوم(عثمانی سلطنت کا خلیفہ),86

احوالِ شخصیہ(کتاب کا نام),128

احیائے خلافت راشدہ,199

ارتداد کی سزا,52

ارجنٹائن (Argentina) ,155

اردن (Jordan),155

اُردو,184

اسپین (Spain),155

استعماری گرفت,VI/استعماری نظام کے شکنجے V

استحسان,44

استحصال,9,90,91,100,101,102,103,
104,112,171

استدراک,44

استنباط,44,182

اسٹیٹ بنک آف پاکستان,21

اسرار و رموز(علامہ اقبال),3

اسرائیل (Israel),155,174,223

اسفند یار ولی,190

اسکندر مرزا,54

اسلام آباد,10

اسلام میں فرد کی آزادی,130
اسلام کا اساسی نظریہ,VII
اسلام کا تصور قانون,152
اسلام کا فلاحی نظام,225
اسلام: ملک کا مذہب,189,62,59
اسلام کا اجتماعی نظام,125
اسلام کے اصولِ حکمرانی,111,74
اسلام کی انقلابی اصلاحات,50
اسلام کی تجربہ گاہ,177
اسلام کا تصورِ عدل,48
اسلام کا تعزیری قانون,52
اسلام کا قانون قصاص,161
اسلام کا نظام انصاف,135,119,95
اسلامائزیشن کا دور,119
اسلامی امارت,96
اسلامی تاریخ,181,84,18
اسلامی تشکیل نو,129
اسلامی تصورِ ریاست,73
اسلامی تہذیب و تمدن,34
اسلامی جمہوری اتحاد,131,125
اسلامی جمہوریت,168
اسلامی جمہوریہ,189,107,96
اسلامی حکومت,73,148,149,179,180, 201
اسلامی دستور,144,123,106
اسلامی ریاست,10,26,27,85,151,165, 223,195,179,169,168
اسلامی ریاست کی بنیاد,201,149,73
اسلامی شریعت,123,115,28
اسلامی فقہ,129,157/ اصول فقہ,43,157, 158
اسلامی فقہ کے مکاتب فکر,129,128
اسلامی قانون,17,34,35,36,37,38,44, ,163,152,150,129,126,86,85 180,170,167,166,165
اسلامی قانون کی بنیادیں,36
اسلامی نظام,145,125,116,106,45,41
اسلامی نظریاتی کونسل,46, 49, 124, 160, 189
اسلامی نظریہ,166,97,90,81,23,20
اسلامی نظریۂ حیات,108,23
اسلامیہ کالج پشاور,180,55
اسوۂ رسولؐ,34
اشتراکی انقلاب,93
اشتراکی روس,96
اشتراکی ریاست,54
اشتراکیت,104,102,8
اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر,69
افریقہ (Africa),32
افغانستان (Afghanistan), 96, 128, 174
افغانستان، اسلامی جمہوریہ,96
افغانستان میں امریکی مداخلت,173
افیون,91
اقبال (علامہ محمد),3,9,10,17,19,23,27, 32, 33, 35, 41, 67, 177, 178, 221,220
اقبال احمد صدیقی,20
اقبال حیدر، وزیر قانون,176
اقلیتوں کا تحفظ, 112/اقلیتوں کی آزادی, 170/ اقلیتوں کے حقوق,30,27
اکرم خان، مولانا,69
اکثریت کے حقوق,170,30
اکھنڈ بھارت,20

الاعراف(سورۃ),31
الفاتحہ(سورۃ),12,6
اٰل عمران(سورۃ),207,203,174,148
الاحزاب(سورۃ),147
الانفال(سورۃ),174,104
البقرۃ(سورۃ), 4, 5, 30, 40, 103, 137,
146,138
الحجرات(سورۃ),216
الحدید(سورۃ),187,42
الروم(سورۃ),42
الشعراء(سورۃ),103
الشوریٰ(سورۃ),187,146
العنکبوت(سورۃ),40
المائدہ(سورۃ), 31, 32, 145, 186, 187,
201
النساء(سورۃ),147,146,84,31
النور(سورۃ),147
الفاروق,205
الہامی ہدایت,VI
اللہ کی حاکمیت,145,96,95,80,71
اللہ کے خلیفہ,206
اللہ کی شریعت,215,157
المفردات,147
الیکشن کمیشن,83
امام ابوحنیفہؒ,149,32
امام احمد بن حنبلؒ,32
امام راغب اصفہانیؒ,147
امام شافعیؒ,32
امام غزالیؒ,32
امام مالکؒ,32
اُمت مسلمہ,224,220,199,54,35
امریکا (America), 22, 23, 25, 32,
154, 155, 163, 173, 174, 175,
220,198,197,189,186,176
امریکہ کی عدالت عالیہ,154
امریکہ میں تحریری دستور,154
امریکی قانونی روایت,154/امریکی مقتدرہ,198
امم سابقہ,144
امورِ خلافت,217
اُموی دور,43
امیر کا اجتہاد,205
امین احسن اصلاحی، مولانا,215
انبیاؑ,12
انتخابات ۱۹۹۰ء,141,125,116
انتظامی مجسٹریٹ,183,182
انجیل,36
انڈین نیشنل کانگرس,16
انسان کا مقصدِ وجود,4
انسانیت کا ارتقا,V
انسانی تاریخ,199,14,8,7,6
انسانی تہذیب,7
انسانی حقوق,160,98,63,59,27
انسانی ضمیر,9
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز,VI
انصار,224,215
انقلابِ ایران,96
انقلابِ فرانس,93
انگریز کا سو سالہ دور,158
انگریزی اخبارات,165
انگریزی دورِ اقتدار,164
انگلستان,220,164/انگلستان کا نظام,220
اہلِ بدر,204
اہلِ تشیع,129
اہلِ شوریٰ,204

اہلِ عراق کی بیوائیں,208
اوباما (Barack Obama), 198
اوس اور خزرج,215
اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،,73
اے این پی,182,176,175
ایران ,155,128,96,32
ایم کیو ایم,191
اینگلو سیکسن (Anglo-Saxon),152
ایوان ترگینف (Ivan Turgenev),8

ب

بدھ مت,16
برازیل (Brazil),155
برطانوی استعمار,15
برطانوی اقتدار,44
برطانوی پارلیمنٹ,130
برطانوی دور میں شخصی قانون,158
برطانوی سامراج,17
برطانیہ کے عدالتی نظام کی تاریخ,189
برطانیہ کی قانونی تاریخ,153
برعظیم پاک وہند,67,28,14
بڑی طاقتوں کی بلیک میلنگ,190
بزم اقبال، لاہور,20
بش (George W. Bush), 198,175
بلوچستان,180,109,23
بنواُمیہ,215
بنوزہرہ,215
بنوہاشم,215
بنی اسرائیل,223,174
بنیادی حقوق, 53, 58, 59, 62, 63, 77, 81, 97, 106, 107, 111, 118, 119, 163,159,141,125
بہادر یار جنگ,34
بھارت,89,88,73,61,54,25,22
بھارتی دستور,89,88,87
بونہام، ڈاکٹر,153
بیرسٹر اعتزاز احسن,60
بے نظیر بھٹو,176
بیت المال,219,202
بیعت عقبہ ثانی,222

پ

پارٹی پرستی سے احتراز,214
پارٹی کی عصبیت,215
پارلیمنٹ کے اختیارات,156,82,61
پارلیمنٹ کی بالا دستی, 118, 141, 144, 153, 163,156,155
پاک امریکہ تعاون,VI
پاکستان تحریک انصاف,221
پاکستان قومی اتحاد,49
پاکستان کا اعلیٰ ترین قانون,142,132
پاکستان کا مطالبہ,180,166,55
پاکستان: سیکولر ریاست,165
پاکستان کا اسلامی تشخص,69
پاکستان کا دستور ۱۹۷۳ء,142,20
پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی,93
پاکستان کی تخلیق,90
پاکستان کی فوج,175
پاکستان کے قبائلی علاقے,174
پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ,150

پٹھانستان,19
پرسنل لا,184
پروفیسر باسو (Bassaw) ,89
پروفیسر جان لوئیس اسپوزیٹو (John Louis
Esposito),85
پروفیسر جان وول (John O. Voll),85
پروفیسر خورشید احمد, VIII, VII, 3, 25, 53,
221,173,79
پروفیسر چکرورتی (Chakravarty),75
پرولتاری,8
پرولتاریہ کی آمریت,101
پرویزیت,129
پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس,161
پس ماندہ طبقوں کے جائز حقوق,76
پشاور ہائی کورٹ,173
پشتو,184
پلاننگ کمیشن,49
پہلا دستور ۱۹۵۶ء,93
پہلی جنگِ عظیم,175
پولیس ایکٹ,164
پی اے سارو کن (Pitirim A. Sorokin),7
پیٹن، ماہر قانون (Paton),151
پیپلز پارٹی,97,99,100,105,107,108,
197,175,131,109

ت

تاریخ انسانی,198,6
تجدد کے علمبردار,129
تجدیدِ دین,14
تحریکِ آزادی کے قائدین,89
تحریک اسلامی,150,28,26
تحریک پاکستان, VII, 11, 18, 22, 27, 34,
54, 67, 69, 70, 80, 89, 94, 110,
177
تحریکِ خلافت,16
تحریک نفاذِ شریعت محمدی,175
تحریکِ نفاذ فقہ جعفریہ,132,128
تحریم خمر,52
تخلیق آدم,4
تدوینِ قانون,126
ترجمان القرآن (ماہنامہ),VIII
ترقی اور تشکیلِ نو کا عمل,197
ترکی (Turkey),32
ترمذی (کتاب حدیث),84
تشکیل پاکستان,16
تعلیم کالادینی نظام,41
تعلیمی کمیشن,133
تکافل اجتماعی,42
تہذیبی تبدیلی,7/تہذیبی تشخص,16,14
تھیوکریسی (Theocracy),165,141,27
تورات,36

ث

ثقیفہ بنو ساعدہ,215,203

ج

جاپان (Japan),155
ججوں کے وضع کردہ قوانین,84
جدید تعلیم کی تحریک,15
جرح کا حق,64
جنرل ایوب خان,119,54
جنرل پرویز مشرف,197,176,175,174,60
جنرل ضیاء الحق,131,124,119,49,46,45,

162
جنرل یحییٰ خان,60
جرمنی (Germany),93,155
جسٹس اعجاز افضل خان,62
جسٹس ثاقب نثار،62,79,83,87,96
جسٹس جان مارشل (John Marshal),154
جسٹس جواد ایس خواجہ,62,71,75
جسٹس دوست محمد خان,62
جسٹس سرمد جلال عثمانی,62
جسٹس شیخ عظمت سعید,62
جسٹس قاضی فائز عیسیٰ,62
جسٹس کوک (Sir Edward Coke),153
جسٹس محمد منیر,54,60,79
جسٹس وجیہہ الدین احمد,63
جسم و جان کی حفاظت,52
جعفری فقہ,128
جغرافیائی وطن پرستی,9
جماعت اسلامی,99
جمعیت علمائے اسلام,109
جمہوری دستور,106
جمہوری روایت,154
جمہوری طرزِ حکومت,110
جمہوری ممالک,153
جمہوری نظام,67,125,203,211
جمہوریت، بلاواسطہ,214
جنس کی بنیاد پر امتیاز,185
جہاد,225
جہنم,51
جوڈیشل اکیڈمی,157
جین مت,16

چ

چیف جسٹس افتخار چودھری,60
چیف جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلیس (Alvin Robert Cornelius),73
چیف جسٹس حمود الرحمٰن,60
چیف جسٹس ناصر الملک,62
چیف جسٹس ہوبرٹ (Hobert),154
چیف جسٹس ہولڈ (Hold),154
چین (China),189

ح

حاکمیتِ الٰہی,154
حاکمیتِ جمہور,155
حامد الانصاری غازی، مولانا,148
حج,108
حدود, 10, 28, 29, 30, 37, 43, 48, 52, 71, 72, 73, 75, 76, 77, 80, 81, 82, 83, 85, 86, 98, 105, 123, 154, 156, 179, 206, 212
حدود آرڈیننس,124
حدود، سرقہ اور حرابہ,52
حرف اقبال,10
حضرت آدم علیہ السلام,V
حضرت ابو بکرؓ,200,203,209,212,215,216,217
حضرت ابو عبیدہؓ,218
حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ,208
حضرت اسامہ بن زیدؓ,200
حضرت خالد بن ولیدؓ,202
حضرت خدیجہؓ,223
حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ,215
حضرت عثمانؓ,39,203,215,219
حضرت علیؓ, 84, 202, 204, 210, 215,

216,217,218,219,220
حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب,215
حضرت عمرؓ, 84, 201, 202, 203, 205, 206, 208, 209, 212, 213, 218, 219
حضرت عمر بن عبدالعزیز,43,50
حضرت عمرو بن عاصؓ,210
حضور پاک ﷺ, V,5,26,31,32,35,71, 73, 108, 145, 168, 187, 221, 224,225
حقوق العباد,51,224
حقوقِ انسانی,27,95,111,185,210
حقوق اور آزادیوں کا تحفظ,209
حکومت پاکستان,28,55,123,173
حلال وحرام کی حدود,76
حمید رضا صدیقی,74
حنبلی مسلک,128
حیدر آباد دکن,73,179

خ

خاتم الانبیا,30
خالد انور ایڈووکیٹ,93
خالد رحمٰن,VI,VIII
خان عبدالغفار خاں,18,19
خاندانی نظام, 44, 111/ ماں: خاندان کے ادارہ کی بنیاد,223
ختم نبوت,108
خدا کی حکومت,149
خصوصی عدالتوں کے قیام کا بل,121
خصوصی عدالتیں,64
خطبہ الٰہ آباد (علامہ اقبال), 10, 17, 67, 66, 178
خطۂ ہند,14
خلافت راشدہ,43,50,84,198,199,200, 203, 204, 205, 206, 208, 209, 210, 211, 212, 213, 214, 215, 216,220
خلافت عثمانیہ,85
خلفائے اربعہ,198,199,205,207,209, 215,220
خلیفہ کا انتخاب,203
خوارج,210,215
خودکشی,80
خیبر پختونخوا,34,109,173,191

د

دارالدارالقضا,182,192
دارالقضا,182,192
دُرہ کی شرعی سزا,162
دستورِ پاکستان,81,87,181/دستور ۱۹۶۲ء,94/ دستور ۱۹۷۳ء, 46, 70, 94, 96, 97, 101, 105, 107, 119, 120/ دستور ۱۹۸۵ء,119
دستور ساز اسمبلی, 28, 71, 75, 88, 89, 93, 123,150,180
دستور کی اسلامی دفعات,62,65
دستور کے بنیادی خدوخال,53,61,62
دستوری اصولِ قانون,61
دستوری ترمیم,59,62,82,83,120,122, 124, 126, 139, 143, 155, 162, 192
دستوری ترمیم کا بل,121
دستوری حکومت,200
دستوری عدالت,155

دستوری کونسل,155
دفاع کا حق,64
دلّی(دہلی),220
دہشت گردی,65,53
دہشت گردی کے خلاف جنگ,174,VI
دو قومی نظریہ,17,14,13,12,3
دور غلامی,15,44/دور غلامی کے قوانین,164
دین کی جدید تعبیر,27
دین وایمان کا تحفظ,52
دیوانی مقدمات,184

ڈ

ڈرون حملے,175
ڈکٹیٹر شپ,11
ڈنمارک (Denmark),155

ذ

ذوالفقار علی بھٹو,96,105,107,119,156,
157

ر

رالف برے بنٹی (Ralph Braibanti),73
راولپنڈی,180
ربا,25,133,136
رسم ورواج,20,38,117,127,132,167,
189
رمضان المبارک,121,122
رموزِ بے خودی(علامہ اقبال),33
روزہ,40
روس (Russia), 91, 93, 100, 101,
220
روسی دستور,102
روشن خیالی,15
ریاست سوات,173
ریاست امب,181
ریاست کا فلاحی تصور,206
ریاست کا مذہب,79,90,95,108
ریاستِ مدینہ,221
ریڈ کراس (Red Cross), 109

ز

زارِ شاہی,93
زرداری، صدر آصف علی, 175, 176, 182,
190
زکوۃ,108,126,224,225
زنا,52

س

سامراجی دور,163,164
سامراجی دور کے قوانین,158,164
سائمن کمیشن (Simon Commission),
16
سبّی دربار,35
سپریم کورٹ,48,53,55,57,60,66,79,
82, 87, 88, 90, 155, 158, 160,
161, 173, 182, 192/سپریم کورٹ کا
فیصلہ,60,88,90
سرحد(صوبہ),19,34,176,180
سرحدی گاندھی,19
سرزمین ہند,15
سرسری سماعت کی فوجی عدالت,53
سرکاری ملکیت,102

سرمایہ,181,102,99,92,91
سرمایہ دارانہ طبقہ,102,91/سرمایہ دارانہ نظام,99, 102
سری لنکا (Sri Lanka),155
سزائے موت,189
سعودی عرب (Saudi Arabia), 127
سلطان ابراہیم (عثمانی سلطنت کا خلیفہ),86
سلیم سوم (عثمانی سلطنت کا خلیفہ),86
سنتِ رسولؐ, 33, 132, 182, 183, 187, 207
سنی مکاتب فکر,129
سوات,182,181,176,175,173,113, 191,189,188
سود کا خاتمہ,135
سوشل سیکورٹی,225
سوشلزم,101,100,99,96,92,90,79, 110,109,107,105,102
سوشلسٹ اسٹیٹ,101
سوشلسٹ فکر,99
سوشلسٹ معیشت,102
سوشلسٹ منشور,90
سوویت یونین (Soviet Union), 8, 101/سوویت یونین کا انہدام,8
سیاسی پارٹیوں کا ایکٹ, 185/سیاسی پارٹیوں کا نظام, 214
سید غلام بھیک نیرنگ,179
سیکولر تصورِ زندگی,72
سیکولر ریاست,179,54,39
سیکولر سوچ,53,5
سیکولر فسطائیت,29
سیکولر لابی,177,29,22
سیکولرازم,176,175,27,15
سینیگال (Senegal),155

ش

شادی,109,93
شاہ ولی اللہ,32,7
شبیر احمد عثمانی، مولانا,69,34
شبلی نعمانی، مولانا,205
شخصی آمریت,200
شراب کی حد,52
شرعی نظام عدل,176,173,113
شرعی نظام عدل ریگولیشن ۲۰۰۹ء,181,173
شریعت,VII
شریعت اسلامیہ,105
شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ء,125,120,113
شریعت بل, 115, 128, 130, 131, 132, 159,142,141,139,136
شریعت بنچ,161/شریعت کا دائرہ کار,117
شریعت، قانون کا واحد سرچشمہ,185
شریعت کے احکام,202,127,51,46
شریعت کی بالادستی,156,138,117,27,26, 189,165,160
شریعت کی تعریف,182,131,128,127,36
شریعت کے مقاصد,153,37
شعوب,216
شمال مغربی سرحدی صوبہ, 19, 109, 179, 181/این ڈبلیو ایف پی (صوبہ سرحد),191
شمال مغربی ہندوستان,10
شہری قانون,135,119,64
شہریت کے حقوق و فرائض اسلامی ریاست میں,215
شیطان,137,30

ص

صدارتی نظام,97
صفاء کے پہاڑ,208
صنعتی انقلاب,99

ض

ضربِ عضب,57
قاضی کی عدالت,182

ط

طاغوتی طاقتیں,V
طبقاتی تصادم,99
طلاق,93

ظ

ظفر احمد انصاری، مولانا,69

ع

عاصمہ جیلانی کیس,60
عالمِ اسلام,127,95
عالمِ بشریت,10
عالم گیر نظام سیاست,178
عالمی نظام,9
عبدالرب نشتر,69,34
عبدالحفیظ پیرزادہ، وزیر قانون,98
عثمانی سلطنت,86
عثمانیہ یونیورسٹی,73
عدالت کی آمریت,154
عدالت کا نظام,39
عدالتی استبداد,82
عدالتی تدبر,56
عدالتی جارحیت,82
عدالتی حقیقت پسندی,56
عدالتی محاسبہ,135,19
عدالتی موقع پرستی,56
عدالتی نظام, 37, 40, 42, 64, 65, 119, 188,159,132
عدالتی نظرثانی,48
عدلیہ کی آزادی,111,107,77,62,59,48
عدلیہ کے لیے تقرری کا معیار,157
عدلیہ کا نظرثانی کا اختیار,58
عرب,224,73
عربوں کا اسلام,32
عشر,162
عقل وشعور کی حفاظت,52
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی,10
علم الاشیاء,6,5,4
عمرانی معاہدے,66
عمران خان,221
عمرانی معاہدہ,71
عمرہ,143,121
عمرو بن حزمؓ,206
عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی,146,149
عورتوں کے حقوق,125
عورت کی حیثیت,159
عیسائی,170,15,10
عیسائی مشنری,15

غ

غاصب,60
غلام رسول مہر، مولانا,149

غلامی کی میراث,119
غیر مدون قانون,163
غیر مسلموں کے حقوق,138,22
غیر منتخب عدلیہ,82
غیر مسلم,224,223,158,125,105,27
غیر مسلم لابی,27

ف

فاروق ستار، ڈاکٹر,191
فاشزم (فسطائیت),8
فاطمہ بنت محمدؐ,203
فتح مکہ,136
فرانس (France) 220,155,93,
فرانسس فوکویاما (Yoshihiro Francis
8,Fukuyama)
فسطائی ذہنیت,186
فطری انصاف,154
فقہ,181,158,128,43,37
فقہ حنفی,128
فقہ اکبر,149
فن لینڈ (Finland) 155,
فوجی آمریت,161,156,125
فیڈرل شریعت کورٹ,137,136,127,124,
163,162,161,160,159,158

ق

قادیانی مسئلہ,108
قادیانیت,129
قاضیوں کا نظام,188
قانون ساز ادارے,164,162,44
قانون ساز اسمبلی,44
قانون سازی کا اختیار,205
قانون سازی کا حق,154
قانون سازی میں قرآن وسنت کا کردار,95
قانونِ فطرت,127
قانون کلّی,149
قانون کی تعلیم,157,47
قانون کی حکمرانی,203,111,85,81,65,63
قائداعظم (محمد علی جناح),3,17,18,19,20,
54,35,34,33,32,27,23,22,21,
55,68,69,73,90,165,166,
167,168,169,170,171,177,
179,180,221/ کے افکار,169/ لادینی
ریاست کے ہمنوا,168/ کا پیرو,169/ کا
تصور اسلام,32
قبائل,223,216,214
قبائل پرستی,216
قبائلی علاقوں,181,173
قتل کے سامراجی قانون,161
قدیم جاہلیت,50
قذف کی حدود,52
قرارداد لاہور,68,66,16
قرارداد ۱۹۴۶ء,66
قراردادِ مقاصد,1,45,53,59,62,66,69,70,
71,74,75,79,80,81,87,88,89,
94,95,97,103,104,105,110,
180,161,142,124,123,112
قرآن پاک، ملک کا دستور,127/ قرآنِ کریم,V
قرآن کا فیصلہ,186
قرآن وسنت,V,11,28,30,32,35,37,39,
46,47,59,75,81,82,84,95,108,
110,111,117,118,119,120,
121,122,123,124,125,126,

127, 128, 129, 132, 141, 142,
143, 144, 147, 148, 151, 153,
159, 162, 177, 182, 183, 205,
223
قرآن وسنت سے متصادم قانون,82
قرآن وسنت: بالاتر قانون,150,148,143
قرآن و سنت کی بالادستی, 28, 80, 111, 118,
153,141,132,125
قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی پر پابندی,159,59
قرآن وسنت ملک کے قانون کا ماخذ,150,150
قصاص,209,52
قصرِ کریملین(Kremlin),103
قلات,188,180
قوم پرستی,216,9
قومی اسمبلی,175,173,131,106,98,79,
191,176
قومی ریاست,90,55,54,13
قومی سلامتی کا تحفظ,112
قیاس,183,182,44
قیام پاکستان,109,92,67,34,28,18,16,
144,141,123,116
قیام پاکستان کی اصل بنیاد,92
قیصرو کسریٰ,204

ک

کاروان،لاہور,74
کاروبار سلطنت,170
کافر,186,145,76,31
کامن لاء,154
کانگریس,154,75,70,18,17,16
کتاب الجہاد,84
کتاب الشہادۃ,210
کتاب وسنت کی تعلیم,206
کراچی,55,34,20
کراچی بار ایسوسی ایشن,20
کلیسا,10
کمیونسٹ پارٹی,102,91
کوریا (Korea),155
کوسٹاریکا (Costa Rica),155
کوہاٹ,180
کیمرون (Cameroon), 155
کینیڈا (Canada),155

گ

گاندھی جناح مراسلت,179
گاندھی جی,18
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء,160,89
گیلپ (Gallup) کے عالم گیر سروے,186

ل

لاء کالج لاہور,150
لادینی لابی,142
لادینی لبرل جمہوریت,54
لادینیت,142,27
لبرل اقلیت,186
لبرل ازم,142,27
لکھنؤ,220
لیاقت علی خان,180,177,74,33,69
لینن (Vladimir Lenin), 92, 99,
100
لینن ازم,100,99,92,91

م

مارشل لاء۱۹۷۷ء,124
مارکس، کارل (Karl Marx), 99,92,91,
103,102,100
مارکسزم,103,100,99,92,91
مال کا تحفظ,52
مالاکنڈ,191,182,181,176
مالٹا (Malta),155
مانسہرہ,181
متحدہ قومیت,18
متحدہ مسلم ریاست,178
مثالی اسلامی ریاست,180
مجلس دستور ساز پاکستان,21,19
مجلس شوریٰ,204
محتسب,38
محصولاتی قوانین,162,136
محمد اسد، علامہ,149
محمد چہارم (عثمانی سلطنت کا خلیفہ),86
محمد حمید اللہ، ڈاکٹر,149,146
محمد علی بوگرا,54
محمدیؐ آئینِ حیات,33/ محمدی تعلیم,151/
رسالتِ محمدیؐ,222/شریعت محمدیؐ,176
محمود علی قصوری,157
مدرسہ,223
مدینہ, 73, 136, 195, 197, 198, 203,
226,225,224,223,222,221
مدینہ کا ماڈل,226,223
مدینہ کی اسلامی ریاست,198,197,195,136
مدینہ کے قبائل,223
مذہب عیسوی,10
مذہبی پیشوائیت,27
مذہبی فسطائیت,29
مزدوروں کی آمریت,8
مساوات, 9, 18, 19, 20, 21, 76, 100,
225,224,111
مسجد,225,223,218,213,204,108
مسجد: سماجی، حکومتی و عدالتی سرگرمیوں کا مرکز,223
مسجد نبویؐ,108
مسلم پرسنل لاء,158
مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن,34
مسلم اقلیتی صوبے,177
مسلم انڈیا,34
مسلم دنیا,185
مسلم دور حکومت,15
مسلم شناخت کا تحفظ,16
مسلم فیملی لاز آرڈیننس,119
مسلم لیگ,180,109,53,34,17,16
مسلم لیگ کی تنظیم,179
مسلم معاشرے میں کمزوریاں,29
مسلم ممالک کے دساتیر,127,95
مسلمان فقہاء,158
مسلمان وکلاء,158
مسلمانوں کا نظام قضاء,159
مسولینی (Mussolini), 93
مسیحؑ,174
مصالح مرسلہ,44
مصر,210,128
مصلح,184
مصلحین,184
مطالبہ دستور اسلامی,150
مطالبہ نظام اسلامی,123,120,28
معاشیات,99,91
معاہدۂ عمرانی,80
معاہدۂ امن,176
معبود حقیقی کا قرب,225

مغربی تصور قانون,151/ مغربی تہذیب,8/ مغربی دنیا کا پہلا تحریری دستور, 89/ مغربی ذرائع ابلاغ, 27/ مغربی قانون,36
مغربی ممالک,175
مفادِ عامہ,225,224
مفتی محمد شفیعؒ,69
مفتی محمود، مولانا,107,110
مقاصد شریعت,51
مقصود حیات,4,3
مقننہ, 38, 44, 48, 58, 81, 83, 85, 86, 111, 126, 135, 151, 153, 154, 158,156
مکّہ,222
ملّا فضل اللہ,173
ملّا کریسی,159,141/ مُلّا کا اسلام,27
ملتِ اسلامیہ,199/ ملت اسلامیہ پاکستان,44,29
ملتان جیل,69
ملک غلام محمد,60,54
ملک کا اعلیٰ ترین قانون,142
ملک کی سیکولر قیادت,176
ملوکیت,206,204,85,11,9
منکر,207,201,91,51
مہاجر,224
مہتاب عباسی، سردار,176
مواخات کا نظام,224
مودودیؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ, 28, 69, 85, 123, 150
موریطانیہ (Mouritania),96
موطا، امام مالک,210
میاں افتخار الدین,70
میاں محمد نواز شریف,176,143,121,53,27
میثاقِ مدینہ,222
میراث کے قوانین,225
میکیاولی(Niccolò Machiavelli),74
میگنا کارٹا(Magna Carta), 70
میلاد النبیؐ,167,20

ن

ناروے (Norway),155
ندوۃ المصنفین، دہلی,148
نسل انسانی کا تحفظ,52
نظامِ امر,43,39
نظامِ تنقید و محاسبہ,210
نظام جہاں,10
نظامِ سرمایہ داری,92
نظام شوریٰ,50
نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ,124
نظام عقائد و عبادات,192
نظامِ قضا,192,188,181,175,44,42
نظرِ ثانی شدہ اسلام,32
نظریاتی تشخص,95,65,56,14
نظریاتی ریاست,77,54,14
نظریاتی نیشن اسٹیٹ,54
نظریہ پاکستان,79,11/ نظریہ ریاست,170
نظریۂ ضرورت,65,64,60
نفاذِ اسلام,49/ نفاذِ اسلام بذریعہ نظام قضا,181
نفاذِ شریعت ایکٹ, 113, 115, 125, 130, 131, 132, 134, 135, 137, 141, 165,164
نفاذ شریعت بل,141,115
نفاذ شریعت کا مطالبہ,177,141
نماز,224,68,40
نمائندہ جمہوریت,214
نہرو رپورٹ,16

نہل ازم (Nihilism) ,8
نواب اسماعیل خاں,34
نیابتِ الٰہی,4
نیچریت,129
نیشنل عوامی پارٹی,109

و

وحی,V
وطنی قومیت,167
وفاقی شرعی عدالت,143,134,85,82,47
وقف,220,219,42
ویت نام (Vietnam),155

ہ

ہانگ کانگ (Hong Kong),189
ہبّہ (ہدیہ، تحفہ),219
ہٹلر (Adolf Hitler) ,93
ہلال احمر سوسائٹی,109
ہندو,170,166,70,67,18,15
ہندوستان (Hindustan) ,155,16,15, ,163 ,167 ,170 ,177 ,178 ,179, 180
ہندوستان کی تقسیم,166
ہندوستان محکوم,165
ہندوستانی مسلمان,12
ہندو سیکولرازم,15
ہندومت,15
ہندو مجلس دستور ساز,19

ی

یمن (Yemen),128
یمن کا گورنر,206
یورپ,99,32,10
یوسف(سورۃ),145,31
یوگوسلاویہ(Yugoslavia),155
یونان کی شہری حکومت,214